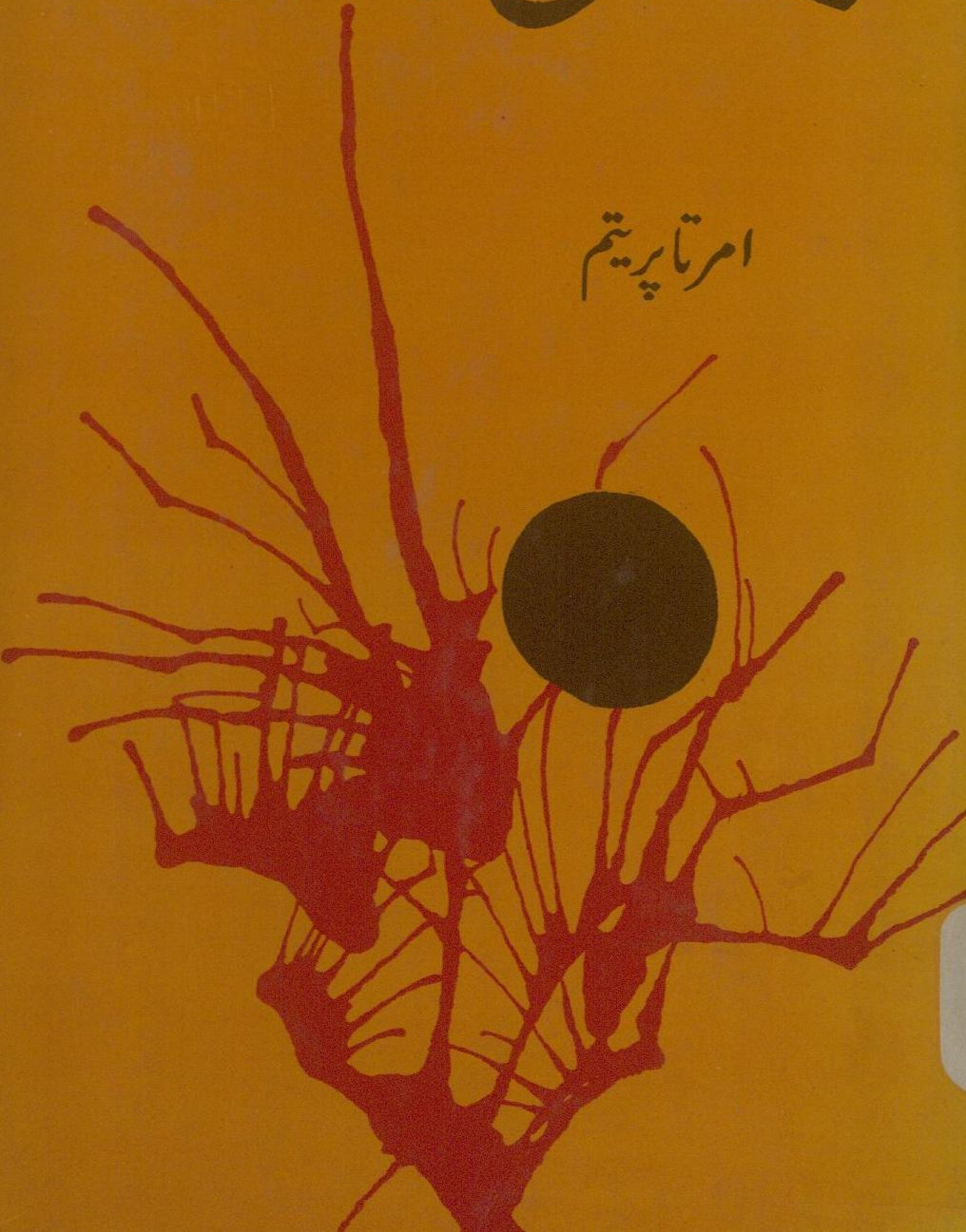
زندگی نامہ

امرتا پریتم



زندگی نامه

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 030649
★ MAILSI ★

امرتا پریتم کی دیگر کتب

١- رسیدی ٹکٹ
٢- محبت نامے
٣- میرا کمرہ
٤- ڈاکٹر دیو
٥- رنگ کا پتہ
٦- ایک لڑکی ایک جام
٧- ناگ منی
٨- بلاوا
٩- پنجر
١٠- انچاس دن
١١- دلی کی گلیاں
١٢- ایک ہاتھ مہندی ایک ہاتھ آبلہ
١٣- میں جمع توں
١٤- امرت لہراں
١٥- جیتی جاگتی زندگی

(١٣ تا ١٥: شاعری)

١٦- یہ سچ ہے
١٧- پانچ برس لمبی سڑک
١٨- ایک اداس کتاب
١٩- امرتا پریتم کے افسانے
٢٠- ایک تھی انیتا

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

زندگی نامہ

امرتا پریتم

مکتبۂ اُردو اَدب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور۔

جملہ حقوق محفوظ ھیں

ناشر ——— سرفراز احمد

مطبع ——— سندھ ساگر پریس لاہور

قیمت ——— -/۲۷ روپے

۱

صبح کے نو بجے تھے، جس وقت اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے چپراسی کو بھیج کر مدن کو اس کی جماعت میں سے بُلایا۔ ہیڈ ماسٹر کا خیال تھا کہ ساتویں میں پڑھتا کوئی چودہ سال کا مدن، جب اس کے کمرے میں داخل ہوگا، اس کا لمبا قد اُس کے کندھوں میں سمٹا ہوگا۔

لیکن مدن کا اونچا سر جیسے جوانی کو چھو رہا تھا اور اس کے تراشے ہوئے نقش پختگی بھی لئے ہوئے تھے، معصومیت بھی۔

ہیڈ ماسٹر کی آواز اس کے گلے میں کچھ تیکھی ہو گئی لیکن ہونٹوں تک لاتے ہوئے اُس نے آواز کو دھیما کر لیا اور پوچھا ــــــ "کل رات آتش بازی کے وقت میں نے تمہیں دیکھا نہیں، تم کہاں تھے؟"

"جی! میں اسکاؤٹ نہیں۔ سول لائن والی گراؤنڈ میں صرف اسکاؤٹ لڑکے بلائے گئے تھے ــــ"

جواب واجب تھا، اس لئے ہیڈ ماسٹر نے سوال کو گھما کر پوچھنے کے بجائے سیدھے پوچھا ــــــ "کل جارج پنجم کے جنم دن کی اسکول میں چھٹی تھی۔ لیکن تم چھٹی والے دن دوپہر کو یہاں اسکول میں کیوں آئے تھے؟"

"جی! دوپہر کو نہیں، صبح۔ جب آپ نے ہی کہا تھا کہ ایک بار دیکھ جاؤں کہ لڑکوں نے

جھنڈیاں ٹھیک سے لگائی ہیں کہ نہیں ——"

مدن کی آواز کہیں سے ڈگمگائی نہیں تھی۔ مگر آواز کی پختگی نے ہیڈ ماسٹر کے شک کو بھی پختگی دی اور اُس نے مدن کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے کہا —— "لیکن میں نے جھنڈیاں لگانے کے لئے کہا تھا، توڑنے کے لئے نہیں۔ تمہارے ساتھ اور کون لڑکے تھے؟"

"کوئی نہیں۔"

"تم نے ہال میں سے بادشاہ کی تصویر اکیلے اتاری تھی؟"

"کون سی تصویر؟ ——" مدن کی آواز ابھی بھی ڈگمگائی ہوئی نہیں تھی۔

"جو تم نے پچھلی گراؤنڈ کے درخت سے باندھ کر جلائی ہے —— تمہارے پاس آگ جلانے کے لئے شاید کاغذ نہیں تھا، اس لئے پچھلی طرف کی جھنڈیاں توڑ کر تم نے آگ جلائی تھی ——"

"میں کچھ نہیں جانتا ——" مدن کے منہ سے نکلا، لیکن ساتھ ہی مدن کو وہ بات یاد آگئی جو ایک دن اُس نے اپنے دادا سے پوچھی تھی کہ آپ کے نام کے ساتھ بھی لکھا جاتا ہے۔ "ہردت۔ پنڈت گنگارام ہردت، اور پتاجی کے نام کے ساتھ بھی پنڈت سرسوتی داس ہردت، ہماری ذات ہے یا آپ نے کوئی تخلص رکھا تھا؟ اور اس کے دادا نے بتایا تھا کہ یہ ہماری ذات ہے۔ اصل میں یہ ہماری ذات ہری دُوت ہوا کرتی تھی، بڑی اونچی اور سچ بولنے والوں کی ذات، لیکن وقت کے ساتھ یہ لفظ بگڑ کر ہردت بن گیا —— اور مدن کے دل میں اُسی بگڑے ہوئے لفظ کو درست معنی والے درست لفظ سے جوڑنے کی ایسی تمنا اُٹھی کہ جلدی سے اُس نے اپنی کہی بات کو درست کرتے ہوئے کہا —— "جی، بادشاہ کی تصویر میں نے جلائی ہے ——"

ہیڈ ماسٹر کی آواز ایک بینت کی طرح تن گئی، اُس نے پوچھا —— "تم جانتے ہو

اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

مدن موہن نے جواب دیا — "جی ہاں، جانتا ہوں۔ ہمارے اسکول کا نام کنگ جارج ہندو ہائی اسکول ہے، اس لئے اسکول کو بہت سی گرانٹ ملتی ہے۔ لیکن میں نے کنگ جارج کی تصویر جلائی ہے، اس لئے گرانٹ بند ہو جائے گی —"

ہیڈ ماسٹر کو لگا کہ بینت کی طرح تنی ہوئی اُس کی آواز کا جواب اس لڑکے نے بینت کی طرح تنی ہوئی آواز سے دیا ہے — اور ہیڈ ماسٹر کی رُوح بڑے فخر سے اُس کی باہوں میں دھڑک اُٹھی۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ کرسی سے اُٹھ کر لڑکے کو گلے لگا لے۔ لیکن اُس نے دونوں کندھوں سے کرسی کی دونوں باہیں تھام لیں، اور سنبھل کر کہا — "سرکار کے بینت پتہ نہیں اسکول کو لگیں گے یا نہیں، لیکن تمہارے ہاتھوں پر ضرور پڑیں گے۔ جاؤ، جا کر اپنے ساتھیوں کو بھی بُلا کر لاؤ۔ میں جانتا ہوں، تم اکیلے نہیں تھے —"

مدن کمرے سے باہر آگیا اور اپنی جماعت میں جا کر اس نے اپنے تینوں ساتھیوں کو بُلا کر کہا — "میں نے تم میں سے کسی کا نام نہیں بتایا، اس لئے تم چاہو تو کہہ دو کہ تم لوگ میرے ساتھ نہیں تھے۔"

مدن کے تینوں دوست کتنی دیر تک مدن کی طرف دیکھتے رہے۔ شاید اس طرح جیسے ایک رہنما کو دیکھ رہے ہوں، اور ان میں ایک رہنما کے لئے شاید احترام اُبھر آیا ہو۔ اس لئے تینوں کہنے لگے کہ وہ بزدل نہیں، وہ بھی مدن کے ساتھ ہاتھوں پر بینت کھائیں گے۔

مدن نے کہیں سے سُن رکھا تھا کہ ہتھیلیوں پہ اگر مینڈک کی چربی لگائی جائے تو بینت کی مار زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ اس لئے اُس نے تینوں سے کہا کہ وہ کسی بہانے اسکول میں سے چلے جائیں اور پاس کے تالاب میں سے مینڈک پکڑ لائیں۔

مدن خود چپ چاپ جماعت میں بیٹھ گیا۔ جانتا تھا کہ اُس پر ہیڈ ماسٹر کی ضرور نگرانی ہوگی۔ لیکن بنچ کے سامنے پڑے ہوئے لکڑی کے تختے پر، اپنی ایک کتاب کھول کر بھی کتاب کی عبارت کی بجائے، وہ اپنی زندگی کی عجیب و غریب عبارت پڑھتا رہا ـــــ جس میں اُس کے تار بابو پتا کی غریبی کی بہت لمبی وضاحت تھی۔

وہ راولپنڈی کے نزدیک چھوٹے سے قصبے مانکیاں آلہ میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کے پتا صرف ایک تار بابو تھے، جنہیں اٹھائیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور اس تنخواہ میں سے بہن بھائیوں کے لئے بھی گھر میں پیسے بھیجنے ہوتے تھے۔ اس لئے اُس کی پیدائش خوشی کی بات ہو کر بھی دُکھ کی چنتا بن گئی تھی۔

ماں نے بتایا تھا کہ تیری پیدائش مبارک تھی کیونکہ اُس مہینے تیرے باپ کی دو روپیہ ترقی ہوئی تھی، وہی دو روپے تو اپنے دودھ کے لئے اپنے ساتھ لایا تھا ـــــ

لیکن وہ جانتا تھا کہ غریبی سے گھبرا کر پتا نے فوج میں نام لکھوا دیا تھا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی خاطر وہ گھر بار چھوڑ کر میسوپوٹیمیا چلے گئے تھے اور عارضی نوکری سے لوٹ کر انہیں پھر وہی تار بابو کی نوکری کرنی پڑی تھی، جہاں اُن کے لئے وہی تیس روپے ماہوار تھے ـــــ زندگی کا بھٹا جھگڑا اس لئے رِسَل نہیں پا رہا تھا، اور اُوپر سے گھر میں ایک اور بچہ آ گیا تھا، اُس کا چھوٹا بھائی ......

پھر بڑے ہاتھ پاؤں ٹیک کر پتا کو کینیا ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر کی نوکری ملی تھی، لیکن تین سال مشکل سے گزرے تھے کہ زندگی کے سامنے دُکھوں کا نیا موڑ آ گیا۔ پتا کی ایک آنکھ میں ایسا درد اُٹھا، جس سے آنکھ کی بینائی چلی گئی، ساتھ ہی نوکری چلی گئی۔ اور واپس آ کر پتا کو جگہ جگہ کام کی تلاش میں بھٹکنا پڑا ...... ۔

اور مدن کو چپ چاپ جماعت میں بیٹھے ہوئے سامنے رکھی کتاب میں سے وہ عبارت دکھائی دینے لگی، جو کسی کتاب میں نہیں لکھی ہوئی تھی، کہ ماں نے براہمن

ہونے کے ناطے جب گھر گھر میں سے 'ہندا'، مانگ کر بچوں کے مُنہ میں نوالا ڈالنا شروع کیا، تو پتا بھی 'ہندے'، کی روٹی کھانے سے انکار کر دیتے تھے'، اور وہ روٹی دیکھ کر اُس کی بھوک بھی مر جاتی تھی . . . . . . صرف چھوٹے تین بھائی اور دو بہنیں جھپٹ کر وہ روٹی چبانے لگتے . . . . . .

'ہندے'، کی روٹی کا کوئی درد مدن کے گلے میں سے اُٹھ کر اس کی آنکھوں میں اُتر آیا، لیکن اُسے اُس وقت احساس ہوا، جب جماعت کے ماسٹر نے اُس کے پاس آکر اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے کہا ـــــ "بہادر بچے رویا نہیں کرتے . . ."

اُس نے ہتھیلی سے آنکھیں پونچھ لیں اور جھٹ سے مسکرا کر ماسٹر کی طرف دیکھا۔ سمجھ گیا کہ ہیڈ ماسٹر کی طرف سے ملنے والی سزا کا، جماعت کے ماسٹر کو پتہ لگ چکا ہے، اور وہ سوچ رہا ہے کہ میں اُسی سزا سے گھبرا کر رو دیا ہوں . . . . .

مدن جانتا تھا کہ اُسے اسکول کی طرف سے سزا ضرور دی جائے گی، لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ اسکول کا کوئی ماسٹر اُسے اپنے دل سے سزا نہیں دے سکتا۔ اس لئے اسکول کے ماسٹر نے بھلے ہی اس وقت اُس کی آنکھوں میں آئے پانی کا مطلب نہیں سمجھا تھا، لیکن اُس کا دل اپنے ماسٹر کے لئے احترام سے بھر اُٹھا، جو بھی کچھ دیر بعد اُس کے ہاتھوں پر بینت مارے گا، مگر مارنے سے پہلے اس کے کان میں کہہ رہا ہے کہ بہادر بچے رویا نہیں کرتے . . . . مدن کو خیال آیا ـــ کہ اس وقت اس کے پتا کو دہلی میں ایک چھوٹی سی نوکری ملی ہوئی ہے، لیکن اپنے بچوں کو پڑھانے کا اُن کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے، اس لئے انہوں نے بچوں کو یہاں گوجرانوالہ میں دادا کے پاس بھیج رکھا ہے، جو کسی کی منشی گیری کر کے بچوں کی فیس بھی دیتے ہیں۔ اور ان کی دو وقت کی روٹی کا جگاڑ بھی کرتے ہیں . . . . . . مگر اُسے لگا کہ یہ وہی گوجرانوالہ ہے، جہاں اُس کے بچپن کو بڑی تیزی سے جوانی چڑھ رہی ہے، اور اس

کی سمجھ میں آیا کہ اُس کی گھر کی غریبی، ملک کے لاکھوں گھروں کی غریبی ہے .... اور اس ملک کے لاکھوں بچے اُس کے جیسے ہیں ....

اور مدن کو لگا —— یہی وہ اسکول ہے، جہاں دسویں جماعت کا ایک اُکم چندیہ سبھی باتیں لکھ کر اسکول کے بچوں کو بتاتا ہے ... جانے وہ کہاں سے سیکھ کر آتا ہے، مگر جب چوری سے وہ کاغذ بانٹتا ہے تو ان کاغذوں کو پڑھ کر بڑا غصّہ آتا ہے کہ ہم ۳۳ کروڑ لوگ مٹھی بھر انگریزوں کے غلام کیوں ہیں ......

آدھی چھٹی کی گھنٹی بج گئی، تو جماعت میں ہیڈ ماسٹر کا حکم ملا کہ سبھی بچے اور سبھی ماسٹر اسکول کے ہال میں اکٹھے ہو جائیں ...... مدن جانتا تھا کہ بیتوں کی مار کے لئے سبھی کی گواہی چاہیئے۔ مدن کے تینوں ساتھی لوٹ آتے تھے، اور وہ چاروں جب ہال کمرے میں سب کے سامنے حاضر ہونے لگے تو ایک نے دھیرے سے مدن کو بتایا —— "صرف ایک مینڈک ملا ہے، روٹی کا ڈبہ خالی کر کے اُس میں ڈال رکھا ہے ......"

اُس وقت مدن کے مُنہ سے نکلا —— "مگر بید ڈبے میں تو وہ مر جائے گا ...."

اور ساتھ ہی اُسے ہنسی آگئی کہ اس وقت پہلے ہی مینڈک کی چربی ہاتھوں پر لگانے کا وقت نہیں رہا تھا، لیکن اگر وقت ہوتا تو چربی نکالنے کے لئے آخر اُسے مارنا ہی تھا۔

۲

اسکول کے ہال سے باہر نکلتے ہوتے مدن اور اُس کے ساتھیوں کا سر اُونچا تھا۔

ہال میں جب ان چاروں کی ہتھیلیوں پر گن گن کر چھ چھ بینت پڑ رہے تھے، ایک سناٹا چھا گیا تھا، اتنا ---- کہ یہ چاروں جب ہال میں سے باہر نکلے، سناٹا اسی طرح ہال میں کھڑا رہا..........

اور مدن نے بڑے غور سے دیکھا تھا کہ سزا دینے سے پہلے جب ہیڈ ماسٹر نے اُٹھ کر سارے اسکول کے سامنے اس سزا کی وجہ سنائی تو اس کی آنکھیں بھی نیچے زمین کی طرف جُھکی ہوتی تھیں اور بینتوں کی آواز سے، جب اسکول کے سبھی بچوں کی آنکھیں حیرانی سے کھلی رہ گئی تھیں، تب اسکول کے سب ماسٹروں کی آنکھیں نیچی ہو گئی تھیں۔

مدن کو ایک ہی ڈر تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے اگر کوئی بھی درد سے چیخ اُٹھا تو اس کی بے عزتی ہو جائے گی۔ مگر اُس کی۔ بے آبروئی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ باری باری سے تینوں کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتا ہوا ---- سر اونچا کر کے ہال میں سے باہر نکلا۔

چاروں نے جماعت میں جا کر اپنے بستے اُٹھائے اور بستے اُٹھاتے ہوتے انہیں لگا کہ اُن کے ہاتھ اکڑنے لگے ہیں۔ اسکول سے باہر آکر چاروں کو یاد آیا کہ روٹی کے ڈبے میں وہ بے چارا مینڈک مر گیا ہوگا۔ وہ جلدی سے ڈبہ کھولنے لگے، مگر اُن میں سے کسی سے بھی ڈبہ نہیں کھل پایا۔ سبھی کے ہاتھوں پہ بینتوں کے نشان اُبھر آئے تھے، پھر ڈھکن کھولنے کے لئے جب انہوں نے ڈبے کو زور سے زمین پر ٹپکا، تو انہوں نے دیکھا کہ ڈھکن کے کھلتے ہی وہ مینڈک اُچھل کر باہر نکلا اور جلدی سے ایک پتھر کے نیچے چھپنے لگا.......

مدن کو ہنسی آگئی ---- "یار! دیکھو! ہم لوگوں نے تو بینت دیکھ کر بھی ہاتھ نہیں چھپائے تھے، تم یوں ہی چھُپ رہے ہو؟"

اُس رات بُوا کی نظروں سے ہاتھوں کو چھُپانے کے لئے مدن نے کہہ دیا کہ آج

اسکول میں ماسٹروں نے مٹھائی بانٹی تھی، اس لئے بہت مٹھائی کھا لی اور کچھ نہیں کھا پاؤں گا........

اُسے معلوم تھا کہ آج اس کی انگلیاں روٹی کا نوالہ نہیں توڑ پائیں گی.......

بُوا نے جب پوچھا کہ آج اسکول میں کاہے کی مٹھائی بانٹی گئی تھی تو مدن کو ہنسی آ گئی۔ کہنے لگا۔۔۔۔ کل ہمارے بادشاہ سلامت کا جنم دن تھا، اس لئے خوشی میں آج غلاموں کو مٹھائی بانٹی گئی.......

مدن کی یہ بُوا سرسوتی دیوی بہت چھوٹی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ تب لگ بھگ چھ مہینے کا بچہ اُس کی گود میں تھا اور تبھی یہ مدن، اس کا بھتیجا پیدا ہوا تھا، جو پیدا ہوتے ہی دودھ کے لئے ترس گیا تھا، کیونکہ ماں سخت بیمار ہو گئی تھی۔ تب اسی بُوا نے مدن کو اپنے دودھ پر پالا تھا۔ بعد میں بُوا کا اپنا بیٹا جب تین سال کا ہو کر نہیں رہا تھا، تو اس کی ساری ممتا مدن کے لئے ہو گئی تھی.......

اِسی بُوا سے کچھ دنوں بعد مدن نے لاڈ سے کہا تھا کہ اُس کا کھدّر پہننے کو دل چاہتا ہے۔ اور بُوا نے سبزی بھاجی میں سے پیسہ پیسہ جوڑ کر بچائے ہوئے کچھ روپے نکال کر مدن کو کھدّر کا کوٹ سِلوا دیا۔

مدن کی ہتھیلیوں پر جب سے بینت پڑے تھے، اس کو اپنا آپ کچھ اچھا لگنے لگا تھا۔ محسوس ہونے لگا تھا کہ ملک کی آزادی کے لئے وہ کچھ کرنے لائق ہو گیا ہے۔ اُن دنوں مدن نے سُنا تھا کہ جو بھی کوئی لال رنگ کا کوٹ پہنتا ہے، پولیس اُسے اُسی وقت پکڑ کر لے جاتی ہے۔ وہ پہلے قدم سے آگے اب دوسرا قدم رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے پولیس کی نظروں میں آنے کے لئے وہ لال رنگ کا کوٹ پہننا چاہتا تھا۔

بُوا نے کھدّر کا کوٹ سِلوا دیا، تو مدن نے گلی کے موڑ والے مسلمان رنگریز سے وہ کوٹ لال رنگ کا رنگوا لیا۔ مگر وہ کوٹ پہن کر ابھی گلی میں نہیں نکلا تھا کہ بُوا نے

وہ کورٹ اُس کے گلے سے اُترواليا- کہنے لگی ــــ " ٹھاکر پالنے میں ہی پہچانے جاتے ہیں- جب تو نے کہا تھا کہ آج اسکول میں بادشاہ سلامت کے جنم دن کی غلاموں کو مٹھائی بانٹی گئی ہے .... اب تو جیل میں چلا گیا تو میرا کیا ہوگا؟"

مدن کے منہ سے اچانک نکلا ــــ " مگر اِس ملک کا کیا ہوگا، بُوا ......!"

پھر بہت تھوڑے سے دن گزرے تھے ــــ جب مدن کو لگا کہ وہ بہت بڑا ہوگیا ہے-

شہر کی 'گنک منڈی' میں اچانک لوگ گیہوں کے دانوں کی طرح اکٹھے ہوگئے- پتہ لگا کہ ایک کڑاہے میں کھارا پانی اُبال کر نمک بنایا جائے گا، اور سرکار کا قانون توڑا جائے گا- اِس ستیہ گرہ کی آوازیں سارے شہر میں گونج رہی تھیں ــــ " انقلاب زندہ باد .... انقلاب زندہ باد ...."

مدن نے پہلی بار انقلاب کے کچھ معنی جانے، اور ستیہ گرہ میں شامل ہونے کے لئے جب 'گنک منڈی' میں پہنچا، تو وہاں چاروں طرف گھوڑ سوار پولیس کھڑی تھی ....

وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، اور بھیڑ میں ہر کسی کا قد مدن سے اونچا تھا- اس وقت اس کی نظر ایک پیپل پر پڑی، جس پر چڑھ کر وہ دُور سے لوہے کا کڑاہا دیکھ سکتا تھا ....

مدن پیپل کی ایک اونچی ٹہنی پر تھا، جب پہلی بار اُس کے ماتھے میں ٹیس جیسا سوال اٹھا کہ پولیس کے لوگ تو انگریز نہیں، ہمارے ملک کے لوگ ہیں، پھر وہ اپنے ملک کے لوگوں پر لاٹھیاں کیوں برسا رہے ہیں ــــ؟

اُس رات مدن کو نیند نہیں آئی- ماتھے کی ٹیسیں کئی سوالوں کی طرح ماتھے میں ٹوٹتی رہیں ....

دوسرے دن پتہ لگا کہ ٹھیک اُسی وقت، اُسی جگہ پہ، شہر کے سبھی لوگ پھر اکٹھے ہوں گے، لیکن اب وہ بھی ہاتھوں میں لاٹھیاں لے کر آئیں گے۔ اُس دن مدن نے بھی کچھ تیکھے اور نکیلے پتھر اکٹھے کر کے اپنا بستہ بھر لیا اور ڈکنک منڈی، چلا گیا۔ پولیس کا گھیرا اُس دن بھی اُسی طرح تھا، مگر لوگوں میں سے آج کوئی بھی نہتا نہیں تھا، اس لئے بہت سی تقریریں ہوئیں لیکن پولیس نے لاٹھیاں نہیں برسائیں۔

اُس دن مدن کو لگا کہ اُس کے سوالوں میں سے ایک سوال کا جواب یہ ہے کہ جو بھی کرنا چاہیئے، طاقت کے بَل پر کرنا چاہیئے۔

یہ خبر دوسرے دن صبح شہر میں پھیلی کہ رات کے اندھیرے میں سرکار نے کانگریس کے کئی لیڈروں کو گرفتار کر لیا ہے۔ یہ سارے شہر میں ہڑتال کا دن تھا، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ ہڑتال کا دن۔ اس لئے مدن اسکول میں جا کر، اُن لڑکوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا جو کہہ رہے تھے کہ آج اسکول میں بھی ہڑتال ہونی چاہیئے....

ہڑتال ہوئی۔ اور مدن سڑک پر کھڑا ہو کر کئی ساتھیوں کے ساتھ مل کر نعرے لگاتا رہا ـــــ "انقلاب زندہ باد.... انقلاب زندہ باد۔"

شہر کا سب سے بڑا پولیس آفیسر ایک پٹھان تھا، جسے سبھی پہچانتے تھے، اور خان صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ جب موٹر سائیکل پر گشت لگاتا ہوا اسکول کے سامنے سے گزرا، تو مدن نے آگے بڑھ کر زور سے کہا ـــــ "ٹوڈی بچہ، ہائے ہائے ......" اور مدن کے ساتھ سبھی لڑکوں نے آواز اُٹھائی ـــــ "ٹوڈی بچہ، ہائے ہائے ......"

خان مُسکرایا، اور اُس نے موٹر سائیکل کو مدن کی طرف موڑ کر، لڑکوں کے پاس آکر کہا ـــــ "بیٹا! ان نعروں سے کچھ نہیں ہوگا، ایکٹ۔"

اُس وقت مدن کو الہام کی طرح اپنے ایک سوال کا جواب مل گیا، کہ جب اپنے

ملک کے لوگ اپنے ملک کے لوگوں پر لاٹھیاں برساتے ہیں۔ وہ غلامی کی کیسی لعنت ہوتی ہے اور ساتھ ہی مدن کو ایک تسلی ہوتی کہ اگر لاٹھیاں برسانے والے اپنی اس مجبوری کو پہچان سکتے ہیں، تو ملک کو کوئی خطرہ نہیں ہے ......

مدن کے دل و دماغ میں جتنے بھی سوال اور جتنے بھی جواب اُٹھتے رہے، ایک دن اُس کے لئے بہت آسان اور واضح ہو گئے ــــــ جب سارا شہر رنگوں سے بھر گیا۔ جن لوگوں کو توفیق تھی، انہوں نے دکانوں کو جھنڈیوں سے سجایا اور جن لوگوں کو توفیق نہیں تھی، انہوں نے رنگدار چادروں سے اپنی دکانوں کے چھجے سجا لئے۔ پتہ لگا کہ آج جواہر لال نہرو اس شہر میں آئیں گے.......

گوروکل کے سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا، جس میں کشمیری مزدور دھان سکھاتے تھے۔ اور آج وہ میدان سفید چاولوں جیسے لوگوں سے بھرا جا رہا تھا......

اُس دن مدن نے پہلی بار جواہر لال نہرو کو دیکھا تھا اور اُس کے مُنہ سے نکلتے ایک ایک لفظ کو اپنی چھاتی میں اُتار لیا تھا....... اُس دن جواہر لال نہرو نے ترنگے جھنڈے کے معنی لوگوں کو سمجھائے تھے اور جھنڈے کو سلامی دی تھی۔

آٹھویں کے امتحان تک کا وقت مدن نے بڑے صبر سے کاٹ لیا اور امتحان دیتے ہی جب دہلی سے پتا کا خط آیا کہ اب مدن کو دہلی بھیج دیا جائے، تو مدن نے چھوٹے سے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھتے ہوئے کپڑوں کی تہہ کے نیچے وہ کھدر کا لال کوٹ بھی چھُپا لیا، جو اُسے ابھی تک کسی نے پہننے نہیں دیا تھا۔

بُوا اور دادا جی جب گوجرانوالہ سے دہلی جانے والی گاڑی میں بٹھا کر چلے گئے، تو گاڑی چلنے کی دیر تھی، جب مدن نے اپنا لال کوٹ نکال کر پہن لیا۔

٣

لال کوٹ پہننے کی جرأت مدن کی چڑھتی جوانی میں تاب سے آ ئی - ایک بار وہ سہارن پور اسٹیشن پر اُتر کر پلیٹ فارم پر بھی گھومتا رہا کہ شاید اُس پر خفیہ یا ظاہری پولیس کی نظر پڑے گی، لیکن وہ چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے اسٹیشن سے کچھ گنّے خرید کر پھر ڈبے میں آ بیٹھا ـــــ کسی نے اُس کی رگ رگ میں جاگ رہے انقلاب کی طرف دھیان نہ دیا۔

مگر دہلی پہنچ کر جب اُس نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، تب پتا نے گھبرا کر اس کی ماں کو آواز دی ـــــ "کرم دیوی! دیکھو، تمہارا مدّی آیا ہے .... لیکن لڑکے کو بعد میں گلے لگانا پہلے اس کے گلے سے یہ کوٹ اُترواد و پہلے ہی ہماری تلاشی ہو چکی ہے ...."

پتہ لگا کہ چار چھ دن پہلے دو بنگالی لڑکے چاندنی چوک گئے تھے - اور ایک سرکاری خیر خواہ کی دُکان سے کپڑا خرید کر پیسے دے گئے تھے اور بنڈل بندھوا گئے تھے کہ کچھ اور خرید و فروخت کر کے، وہ یہ بنڈل لے جائیں گے - وہ چلے گئے تو دس منٹ بعد وہ بنڈل پھٹ گیا اور ساری دُکان میں آگ لگ گئی ....

پولیس تب سے ان لڑکوں کی تلاش میں تھی اور شہر میں جس کے گھر میں بھی ٹائپ رائٹر تھا - اُس گھر کی تلاشی لے رہی ہے، کیونکہ اُن لڑکوں کی ٹائپ کی ہوئی چھٹی پولیس کو ملی تھی کہ یہ واردات بہت چھوٹی ہے، آگے بہت بڑی وارداتیں ہونے والی ہیں ....

مدن کے پتا کے پاس دو ٹائپ رائٹر تھے، کیونکہ وہ ایک اسکول میں لڑکوں کو ٹائپ، شارٹ ہینڈ اور ٹیلی گرافی سکھاتے تھے، اس لئے ابھی تین دن ہوئے، اُن کے گھر کی

تلاشی ہوتی تھی......

مدن نے کوٹ کا رنگ اپنے سینے میں سنبھال کر رکھا لیا اور پتا کے کہنے پر کوٹ اتار دیا۔

دہلی کا اگلا سال، مدن کے لئے آسان نہیں تھا۔ اسکول میں اُس کی نویں جماعت کی فیس ادا کرنے کے لیے اور چھوٹے بچوں کی فیسوں کے لئے گھر میں پیسہ نہیں تھا۔ وہ کباڑیے سے ردی کاغذ خرید کر لے آتا، اس کی ماں لیئی بنا دیتی اور وہ چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھی ساتھ لگا کر اُن کاغذوں کے لفافے بنا کر کھاری باؤلی بازار کے ایک دکان دار کے پاس بیچ آتا۔ اس طرح کوئی ایک یا سوا روپیہ روز کا بن جاتا تھا.......

مگر نئی مشکل اُس وقت آئی جب شہر میں کسی نے لفافے بنانے کی مشین لگالی۔ اور اس کے لیئی والے لفافوں کی بکری بند ہوگئی۔ وہی وقت دسویں جماعت میں داخلہ کی فیس دینے کا تھا۔ پیسے نہیں تھے، اسی وجہ سے مدن کی پڑھائی چھوٹ گئی......

یہ ۱۹۳۵ء تھا، جب مدن سے پڑھائی بھی چھوٹ گئی اور دہلی بھی۔ لاہور سے پتا کے چچا زاد بھائی پنڈت ٹھاکر داس کا خط آیا کہ دیانند اسکول میں کئی طرح کی ٹیکنیکل ٹریننگ دی جا رہی ہیں، اگر مدن کے پتا اپنے بال بچوں سمیت لاہور آجائیں تو لڑکے ٹیکنیکل ٹریننگ لے سکیں گے۔

لاہور، کرشن نگر میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے کر پتا نے ٹائپنگ اور بُک کیپنگ کا کام سکھانے کی چھوٹی سی نوکری ڈھونڈ لی۔ مدن کا چھوٹا بھائی سائیکلوں کی مرمت کا کام سیکھنے لگا اور مدن دس روپیہ مہینہ پر بجلی کا کام سیکھنے لگا۔ لیکن ایک دن مدن کی چھاتی میں سے ایک چیخ نکل کر اُس کی زندگی کے آنے والے سالوں کو چیر گئی ——— خلا کوئی نہیں ——— کہیں نہیں.......

مدن کے پتا کی سڑک پر ایک تانگے سے ٹکر ہوگئی تھی، اور جس وقت ان کو سڑک سے لہولہان اٹھا کر ایک ڈاکٹر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا، ڈاکٹر نے پٹی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

کیونکہ ڈاکٹر کی ایک روپیہ فیس کے لئے اس وقت ایک روپیہ پاس نہیں تھا۔ بہت دیر بھٹکنے کے بعد پتا کو ہسپتال میں پہنچایا جا سکا تھا۔ ہسپتال میں آنکھ کا آپریشن بھی کیا گیا۔ لیکن پتا کی یہ آنکھ بھی نہیں بچ سکی۔ اب دونوں آنکھوں کی نظر کھو چکی تھی۔ اُس وقت ہسپتال کے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر چوٹ لگنے کے فوراً بعد وہ پہلا ڈاکٹر پٹی کر دیتا، تو نظر بچ سکتی تھی۔ یہ ایک روپیہ تھا جس کے لئے پتا کی نظر چلی گئی تھی —— اور مدن کی چھاتی میں ایک چیخ جم گئی —— خدا کوئی نہیں، کہیں نہیں......

یہی وقت تھا جب مدن نے سیاسی لٹریچر پڑھتے ہوتے ایک پری کہانی پڑھی، سوویت روس میں سبھی لوگ برابر ہیں وہ امیر اور غریب نہیں ہوتے.........
اور اُسے لگن لگ گئی کہ اس پری کہانی کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور کانوں سے سُنے گا...

آنکھوں سے محتاج پتا نے مدن کو بک کیپنگ سکھا دی اور انار کلی میں دوائیوں کی دکان ڈاکٹر کشن چند اینڈ کمپنی لمیٹڈ میں پچیس روپے ماہوار کی نوکری لے دی۔ یہ نوکری صبح دس بجے سے شام کے چار بجے تک تھی، اس لئے چار بجے سے گئی رات تک کا وقت مدن کا اپنا وقت تھا.......

اور اُس کا اپنا وقت اُس کے ملک کا وقت تھا.........

لاہور میں جس وقت ڈاک لفافہ کی ایک پیسہ قیمت بڑھنے پر کانگرس کی طرف سے سرکار کے خلاف شہر کا سب سے بڑا جلوس نکلنے کو تھا، اور شہر میں ایک ایک آنے کا چھوٹا سا کھدر کا بنا ہوا کانگرس کا جھنڈا بک رہا تھا، مدن نے ایک آنے کا جھنڈا خرید کر اُس جھنڈے پر شوخ سیاہی سے درانتی اور ہتھوڑے کا نشان بھی بنا دیا اور وہ انوکھا جھنڈا پن کے ساتھ اپنی قمیص پر لگا کر جلوس میں شامل ہو گیا......

اُس دن سینکڑوں لوگوں کا مدن سے سوال تھا کہ یہ جھنڈا اُس نے کہاں سے خریدا؟...... اور اُس دن مدن کا سینکڑوں لوگوں کو جواب تھا کہ یہ جھنڈا اُس نے آنے

والے وقت سے خریدا.......

مدن کی یہ بات اُس کی عمر سے بڑی لگتی تھی —— لیکن اُس نے دلیل دی —— میری نظر میں گاندھی اس لئے بڑا ہے کہ اُس نے عوام کو یہ پہچان دی ہے کہ وہ غلام ہیں۔ مگر اُس پہچان کو صرف ہتھیار ہی باعمل و بامقصد بنا سکتے ہیں، عدم تشدد کبھی بھی باعمل و بامقصد نہیں بن پائے گا۔

اور مدن کے اس خیال کو اُس دن بہت بڑی تائید مل گئی، جس دن اُس نے لاہور کے ٹریبیون اخبار میں ایک مضمون پڑھا —— 'سائنٹفک سوشلزم'۔ یہ مضمون کسی پروفیسر عبداللہ صفدر کا لکھا ہوا تھا، جس سے ملنے کے لئے مدن بے تاب ہو اٹھا۔

یہ ۱۹۳۹ء تھا اور یہ شاید ہونی کا اشارہ تھا کہ مدن کے ایک سیاسی دوست نے کہا کہ وہ عبداللہ صفدر کو جانتا ہے اور وہ مدن کو اُس سے ملا سکتا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ صفدر نے پولیٹیکل ٹریننگ روس میں رہ کر لی ہوئی ہے.......

گوالمنڈی کا ایک مکان تھا —— جہاں مدن کی صفدر سے ملاقات ہوئی۔ صفدر چالیس سال کے قریب تھا اور مدن بائیس سال کا۔ صفدر ایک اثر پذیر شخصیت تھی اور مدن ایک بھٹک رہی جوانی، لیکن ایک ہی ملاقات میں جیسے دونوں ہم عمر ہو گئے......

اُس دن مدن کو صفدر نے بتایا کہ وہ جس لیگ آف ریڈیکل کانگرس مین کا ممبر ہے، اُس لیگ کا بانی ایم این رائے ہے، وہی 'انڈیپینڈنٹ انڈیا' کا ایڈیٹر ہے۔ وہ ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے بادشاہ قیصر کے پاس گیا تھا کہ اُس کی مدد سے برطانوی سرکار سے آزادی حاصل کی جائے، لیکن برطانوی خفیہ پولیس کے جاسوس اُس کی خبر پا گئے تھے۔ اس لئے وہ واپس ہندوستان نہیں لوٹ سکا تھا، وہاں سے امریکہ چلا گیا تھا۔ مگر امریکہ جب جنگ میں شامل ہو گیا، تو جرمنی کے ساتھ اُس کے تعلقات کی وجہ سے اُسے پکڑ لیا گیا۔ وہ ضمانت پر تھا، جب بھاگ کر میکسیکو پہنچا۔ وہاں مارکسزم سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے

میکسیکو میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھ دی ــــــ یہ سوویت یونین سے باہر دُنیا کی پہلی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ ......

۱۹۳۰ء میں ماسکو میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس ہوئی، وہاں ایم، این رائے کو بُلایا گیا تھا۔ وہاں وہ اکتوبر انقلاب کے لیڈروں سے ملا تھا۔ وہاں پر اُس کی کئی ملاقاتیں لینن کے ساتھ ہوئی تھیں۔ ......

مدن کے دل میں گاندھی کے لئے احترام تھا، لیکن وہ گاندھی کے خیالات سے متفق نہیں تھا۔ اُس کے خیال کو تائید ملی جب صفدر نے بتایا کہ لینن کی نظر میں گاندھی عوامی لہر کا سب سے بڑا انقلاب پسند تھا، لیکن رائے کی نظر میں گاندھی مذہبی بحالی یعنی روایتیوزم کا لیڈر ہے، اس لئے رجعت پسند کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس نقطہ پر ان کی بہت لمبی بات چیت ہوئی تھی۔ لینن اور ایم، این، رائے کولونیل سیاست کے بارے میں بھی کئی بار متفق نہیں ہو پاتے تھے، لیکن یہ بات ان کی باہمی دوستی میں فرق نہیں ڈالتی تھی۔

اور صفدر نے بتایا کہ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک ایم، این، رائے ہندوستان کے کمیونسٹ کاموں کی رہنمائی کرتا رہا اور کومنسٹرن یعنی کمیونسٹ انٹرنیشنل میں ہندوستانی فلسفے کی ترجمانی کرتا رہا۔ ......

مدن کے دل میں پیری کہانی کے کئی چہرے اُبھر رہے تھے، جس وقت صفدر نے بتایا کہ ۱۹۲۴ء میں لینن کی موت کے بعد ۱۹۲۷ء میں سٹالن نے رائے کو چین بھیجا تھا۔ لیکن جب رائے چین سے واپس آیا، اُس کے آنے تک سیاسی فضا بدل چکی تھی۔ لینن کے کئی ساتھی مارے جا چکے تھے۔ اُس وقت ۱۹۲۹ء میں رائے کو کمیونسٹ انٹرنیشنل میں سے بے دخل کر دیا گیا، اور وہ لینن کے وقت کی یاد چھاتی میں ڈال کر جرمنی چلا گیا۔ ...

ــــــ اور اب وہ ......؟ مدن کی سانس اُس کی چھاتی میں تیز ہو اُٹھی۔ صفدر نے بتایا کہ ایم، این، رائے ہر خطرہ مول لے کر ہندوستان آیا تھا۔ مگر جولائی

۱۹۳۰ء میں سرکار نے اُس کو پکڑ کر پانچ سال کے لئے جیل میں ڈال دیا تھا۔ وہ جب تک جیل سے رہا ہوا تب تک کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی، اس لئے راسئے کانگرس میں شامل ہو گیا۔ وہ کانگرس میں رہ کر گاندھی وچار دھارا سے الگ انقلابی وچار دھارا قائم کرنا چاہتا ہے.........

یہ صفدر کی ملاقاتیں تھیں، جنھوں نے مدن کے سلگتے ہوئے جذبات کو راستہ دکھایا۔ مدن کے دل کی چنگاریوں کو سمیٹ کر اس کے دل کا شعلہ بنا دیا.....

مدن کے انگوں کو بھی قہر کی جوانی چڑھ آئی۔ روُح کو بھی ــــ وہ صفدر کے مضمون ٹائپ کرتا، اور جو کچھ بھی اُس کی سمجھ کی پکڑ سے باہر ہوتا، وہ صفدر کی مدد سے اپنی سوچ کے دائرے میں لے آتا۔ اب وہ بھی لیگ آف ریڈیکل کانگرس مین کا باقاعدہ ایک ممبر تھا۔ اور وہ اکثر صفدر کے مُنہ سے سُنتا ــــ "کتنا اچھا ہو، اگر تم ہندوستان کے حُب الوطن ہونے کے ناطے سوویت یونین سے پولیٹکل ٹریننگ لے سکو....."

اور مدن کے دل میں سوویت یونین کا دیدار ایک ایسا خواب بن گیا، جیسا ایک ہندو کے من میں تیرتھ یاترا کا ہوتا ہے اور مسلمان کے دل میں حج کا ہوتا ہے۔

انقلاب کب کامیاب ہوتا ہے اور کن حالات میں؟ صفدر نے اسی مسئلہ پر باتیں کرتے ہوئے ایک دن مدن کو بتایا کہ ۱۹۱۹ء میں جب ہندوستان کی خلافت کمیٹی نے مسلمانوں کو ترکی جانے کے لئے کہا تھا، مصطفےٰ کمال پاشا کی فوج میں شامل ہونے کے لئے، جو خلافت کی حمایت میں برطانوی طاقت کے خلاف لڑ رہی تھی، تب اُسی ہجرت لہر میں شامل ہونے کے لئے صفدر بھی کئی جوان مسلمانوں کے ساتھ مل کر چل دیا تھا۔ لیکن انھوں نے جب آمو دریا کو پار کیا، تو وہ غیر بالشویک ترکمانی گروہ کے ہاتھوں میں پڑ گئے تھے۔ اُس گروہ کو مُلاؤں، مولانوں نے برطانوی مدد کے لئے تیار کیا ہوا تھا۔

تب ایم، این، رائے بخارا میں تھا۔ اُس نے یہ خبر سنی تو اُن ہندوستانی مہاجرین کی مدد کے لئے ریڈ آرمی کی ایک پلٹن بھیجی۔ ستر آدمی بچا کر بخارا میں لائے گئے۔ ان میں سے بہت سے کٹر مذہبی خیالات کے تھے جو صرف ترکی جانا چاہتے تھے، لیکن رائے کے سمجھانے پر اُن میں سے پچاس آدمی تیار ہو گئے کہ وہ سنٹرل ایشیا میں رہ کر پولیٹکل ٹریننگ لیں گے اور پھر اپنے ملک میں لوٹ کر بغاوت کے لئے کام کریں گے۔ وہیں رائے کے ساتھ صفدر کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور وہ رائے کے کہنے پر ماسکو میں، مشرقی ملکوں کے محنت کشوں کی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا تھا۔

مدن کے اسکول کی چھوٹ چکی پڑھائی نے ماسکو کی اُسی یونیورسٹی کا خواب ایک گہرے سانس سے لیا......

صفدر نے بتایا کہ وہ یونیورسٹی لینن نے ۱۹۲۲ء میں شروع کی تھی ـــــ کہ جہاں کمیونسٹ ایشیا کے لئے مستقبل کے رہنما تیار کئے جا سکیں۔

صفدر نے تقریباً دس سال وہاں گزارے تھے۔ ایک روسی لڑکی کے ساتھ شادی بھی کی تھی، لیکن ہندوستان کی سیاست کو اُس کی ضرورت تھی، اس لئے وہ اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر ہندوستان آ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ برطانوی خفیہ پولیس سے بچا رہا تھا، لیکن پھر اُسے قید کر کے لاہور قلعہ میں ڈال دیا گیا تھا۔

جیل سے رہائی کے بعد وہ پھر سے ایم، این، رائے سے مل پایا تھا اور اب اُس کے ساتھ تھا۔ مگر اداس تھا کہ رائے اب سوویت نظروں میں وہ نہیں رہا تھا جو ایک ایماندار ساتھی ہونے کے ناطے ہونا چاہیئے تھا.....

صفدر کا سب سے بڑا خواب یہ تھا کہ وہ ایک بار پھر سوویت یونین میں جائے اور اسٹالن کی نظر میں رائے کی قدر پیدا کر سکے......

یہ وقت تھا ـــــ جب مدن کے خواب کی بھی صفدر کے خواب سے دوستی

ہو گئی.........

۳ستمبر ۱۹۳۹ء کا دن تھا، جب انگلینڈ نے جرمنی کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس جنگ کے دنوں میں سن ۱۹۴۰ء کا جولائی کا مہینہ تھا، جب صفدر کو گرفتار کر لیا گیا، اور مدن جس شام سے گوالمنڈی تھانے میں مل کر آیا، اسی کی اگلی صبح اس نے اخبار میں پڑھا کہ صفدر تھانے میں سے لاپتہ ہے اور پولیس اسے ہر جگہ تلاش کر رہی ہے۔

مدن تفتیش کی پکڑ میں آیا، لیکن اصل میں وہ حیرانی کی پکڑ میں تھا۔ صفدر کے لاپتہ ہو جانے پر اسے لگا کہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب لاپتہ ہو گیا ہے......

۴

سماجی اور سیاسی حالات مدن کو اداس کر دیتے، آفتاب اس کی چھاتی میں ڈوب جاتا، اور جب انقلاب اس کی رگوں میں مچلنے لگتا تو جیسے آفتاب اس کی چھاتی میں اُگ آتا۔ لیکن ڈھائی ہفتے ہو گئے تھے، جب سے صفدر چلا گیا تھا۔ مدن کو سدھ نہیں تھی کہ روز سورج کب چڑھتا ہے، اور کب ڈوبتا ہے.........

لاہور والے گھر میں دو کمرے تھے، جہاں اس کے ماں باپ اور بھائی بہن رہتے تھے اور ایک برساتی سی اوپر کی منزل پہ تھی، جو مدن کے لئے تھی۔ گھر والے صرف اتنا جانتے تھے کہ مدن رات کو بڑی دیر تک پڑھتا رہتا ہے، لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے لئے بچھائی گئی نوار کی چارپائی کو اس نے کبھی بھی لیٹنے تک کے لئے استعمال نہیں کیا تھا۔

انقلاب والے راستے پر قدم رکھ کر مدن نے سوچا کہ اسے آنے والے وقت کے لئے، ابھی سے تیار ہونا چاہیئے۔ اس لئے وہ دن میں فٹ بال کھیلتا اور جسم کو تیار کرتا۔

رات کو وہ فرش پر سر کے نیچے اینٹ رکھ کر سوتا کہ کل کو جب وہ کسی جیل کی کوٹھری میں ہوگا، تو اس کے سر کو پتھر کے تکیے کی عادت ہوگی......

پھر پتا کو شک ہوا کہ مدن رات کو ممنوع شدہ کتابیں پڑھتا ہے۔ مدن بھلے، ہی اپنے کاغذوں اور کتابوں کو چارپائی کی نوار میں چھپا کر گھر سے باہر جاتا تھا، لیکن اُس کے پتا نے اُس کا وہ ٹھکانہ بھی کھوج نکالا۔ اور پتا کو بھلے ہی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا تھا، تو بھی جان گئے کہ وہ ضرور کوئی ایسے کاغذ پتر ہیں، جو قانون کی زد میں آسکتے ہیں اور وہ مدن کے گھر سے جانے کے بعد ان کاغذوں، کتابوں کو نکال کر غائب کرنے لگے......

پھر سوموار تھا، ۱۹ اگست ۱۹۴۰ء۔ جب مدن صبح کو کچھ کھا کر کام پر جانے لگا، اُس کے پتا باہر دروازے کے پاس کھڑے تھے، مدن کے پیروں کی آہٹ پہچان کر بولے — "کون ہے، مدن؟ اچھا بیٹا جاؤ۔ نہ تمہیں میں روک سکتا ہوں، نہ بھگوان روک سکتا ہے ....تم جا تو رہے ہو، لیکن تم آؤ گے نہیں:......"

مدن حیران ہوا، کہنے لگا — "کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں کام پر جا رہا ہوں، اور مجھے کہاں جانا ہے؟ میں آپ کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟"

جانے یہ کیسی نظر تھی، جو پتا کی نابینا آنکھوں میں تھی اور مدن جب سچ مچ کام پر پہنچا، تو اُسے اس کے شاہدرہ والے ایک دوست کا پیغام ملا کہ مدن جب بھی آئے، اُسے ٹیلی فون کرے۔ مدن نے فون نہیں کیا، سائیکل لے کر شاہدرہ چلا گیا اور اُس کے دوست نے اوٹ میں ہو کر ایک کاغذ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ جو صفدر کے ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا کہ میں روس جا رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ تمہارے لئے اچھا ہوگا اگر تمہیں جانا ہے تو جس آدمی کے ہاتھ میں نے خط بھیجا ہے، وہی تم کو میرے پاس لے آئے گا۔ ہو سکے تو راستے کے گزارے کے لئے کچھ پیسوں کا انتظام کر کے ساتھ لے آنا۔

مدن نے دھڑکتے ہوئے دل سے دوست سے پوچھا ـــــ "یہ خط کون لایا ہے؟ وہ کہاں ہے؟"

دوست نے دیا سلائی جلا کر وہ صفدر والا خط جلا دیا، اور کہا ـــــ "اُس آدمی کا نام غلام محمد ہے۔ انار کلی والے مسلم ہوٹل میں بیٹھا وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ تم وہاں جا کر تین بار اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرنا۔ وہ تمہیں اس نشانی سے پہچان لے گا....."

مدن جلدی سے سائیکل پہ پاؤں رکھنے لگا، تو اُس کے دوست نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ پوچھا ـــــ "تم ضرور جاؤ گے؟" مدن نے بازو چھڑا کر، دوست کا ہاتھ دبایا اور جلدی سے اس دکان پر پہنچا، جہاں نوکری کرتا تھا۔ یہ اُس کا بنک جانے کا وقت تھا، دکان کی نقدی اور چیک جمع کروانے کا۔

مینجر نے جب تین ہزار روپے نقد اور پانچ چھ ہزار روپے کے چیک تھمائے تو مدن کی چھاتی میں زور سے ایک خواب دھڑکنے لگا.......

مینجر کہہ رہا تھا ـــــ "آج بہت ضروری بلٹیاں آئی ہوئی ہیں، وہ ضرور چھڑانی ہیں، بنک میں بھلے ہی کتنی دیر لگ جائے، لیکن وہ بلٹیاں لے کر آنا......"

مدن نے ساری ہدایت سُنی اور سائیکل پر انار کلی کے مسلم ہوٹل چلا گیا۔ بیٹھنے کے لئے کرسی ڈھونڈنے کی نظر سے کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کو سرسری طور سے دیکھا، اور تین بار ہاتھ سے بالوں کو سنوارا.......ایک آدمی اُٹھ کر جب مدن کے پاس آ کھڑا ہوا تو مدن نے اُس سے گلے ملتے ہوئے کان میں پوچھا ـــــ "تمہارا نام کیا ہے؟" اُس نے تپاک سے گلے ملتے ہوئے کان میں کہا ـــــ غلام محمد، صفدر نے بھیجا ہے......"

دونوں نے کرسیوں پر بیٹھ کر ایک ایک پیالہ چائے منگوائی، اور چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مدن نے پوچھا ـــــ "وہ کہاں ہے؟" غلام محمد نے کہا ـــــ

"پتہ ٹھکانہ نہیں بتا سکتا، لیکن اُس شہر میں لے جاؤں گا۔"

مدن نے جیب میں سے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور اُس سے کہا —
اچھا تم بس اڈے پر جا کر ٹکٹیں خریدو، میں پورے ایک گھنٹہ بعد وہاں پہنچ جاؤں گا......

اُس وقت لاہور میں ایک بڑا بس اڈہ ہوا کرتا تھا، نند ابس سروس کا، جو شاہ عالمی دروازے اور لاہوری دروازے کے بیچ میں پڑتا تھا۔ اس لئے غلام محمد پیدل اُس طرف چل دیا، اور مدن سائیکل لے کر پنجاب نیشنل بنک کی طرف۔

مدن نے سبھی چیک جمع کروا دیئے اور اپنے راستے کے خرچ کے لئے ڈیڑھ ہزار روپے رکھ کر باقی نقد روپے بھی جمع کروا دیئے۔ پھر جلدی سے مینجر کو فون کیا —
"آج بنک میں بہت بھیڑ ہے، اس لئے مجھے تین چار گھنٹے لگ جائیں گے......"

اور بنک سے باہر آکر جیب میں رکھے ہوئے ڈیڑھ ہزار روپوں کو ٹٹولتا ہوا، وہ سالم تانگہ کر کے جلدی سے بس اڈے کی طرف چل دیا........

بس اڈے پر غلام محمد اُس کے انتظار میں کھڑا تھا کیونکہ جس بس کی اُس نے دو ٹکٹیں لے رکھی تھیں، وہ اب چلنے کو تھی.......... مدن جلدی سے بس میں بیٹھ گیا۔ مگر وہ ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ یہ بس کہاں جا رہی ہے۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ شہر بھلے ہی کوئی ہو، لیکن اُس شہر میں اُس کا صفدر ضرور ہوگا.......

اور بس کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک مدن کو ہوا کے جھونکے جیسا خیال آیا کہ آج صبح اس کے پتا نے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا تھا —
"اچھا، جاؤ بیٹا۔ تم جا رہے ہو، لیکن تم آؤ گے نہیں........"

اور ہوا کا وہ جھونکا مدن کی سانسوں کو چھو کر — تاریخ کی سانسوں میں گھل مل گیا.......

۵

بس جب لاہوری دروازے والے اُس چوک میں پہنچی، جس کے ایک موڑ سے انار کلی بازار شروع ہوتا تھا اور اُسی موڑ کے سرے پر وہ دکان تھی جس میں وہ کام کیا کرتا تھا، تو مدن کا دل سہم گیا۔ لگا ——— کسی نہ کسی کی نظر بس پر ضرور پڑ گئی ہوگی .... اور کیا جانے اب تک دکان کے بڑے مینجر چمن لال نے کسی کو بنک میں بھیج دیا ہو.... ۱۰۰ اور اب تک پولیس اُس کے پیچھے لگ چکی ہو.....

ویسے بھی صفدر والے معاملے کی تحقیقات کرتے ہوئے جب پولیس نے مدن کو حوالات میں رکھا تھا تو چھوڑتے وقت لاہور سے باہر جانے کی مناہی کر دی گئی تھی۔ ساتھ ہی راستے کی دھول کی طرح ایک اور اڑتا ہوا خطرہ اُس کی آنکھوں میں پڑنے لگا کہ کیا جانے یہ غلام محمد ہی پولیس کا آدمی ہو، اور مجھے لاہور سے باہر لے جا کر مناہی کو توڑنے کے جرم میں پولیس نے پکڑ وانے کا یہ راستہ نکالا ہو...

بس شہر سے نکلی تو اگلا تھانہ ——— شاہدرہ والا تھا اور مدن کو خطرہ محسوس ہوا ——— کہ اس شاہدرہ والے تھانے پر اُسے بس میں سے اتار لیا جائے گا...

مگر شاہدرہ والا تھانہ گزر گیا، تو مدن نے اطمینان کا سانس لیا تھانے سے آٹھ دس گز پہلے دو سڑکیں بنٹ رہی تھیں ——— بائیں ہاتھ والی لائل پور کی طرف جاتی تھی اور دائیں ہاتھ والی سڑک گوجرانوالہ کی طرف۔

بس جب گوجرانوالہ پہنچنے کو ہوئی تو مدن نے غلام محمد سے پوچھا کہ انہیں گوجرانوالہ اُترنا ہے یا آگے وزیر آباد جانا ہے؟ مدن جانتا تھا کہ یہ بس گوجرانوالہ کے

راستے چل پڑی ہے، تو وزیر آباد تک ضرور جائے گی۔

اُس وقت غلام محمد نے بتایا کہ وزیر آباد پہنچ کر آگے انہیں سیالکوٹ کی بس پکڑنی ہے آگے گاڑی میں جموں جانا ہے۔ اُس وقت مدن نے کہا کہ اچھا ہوا گر وہ الگ الگ بسوں میں جموں جائیں۔ اس پر غلام محمد نے اتفاق کر لیا اور کہنے لگا ——— اچھی بات ہے۔ میں جموں کے مسلم ہوٹل میں تمہارا انتظار کروں گا......

مدن گوجرانوالہ میں اتر گیا اور غلام محمد اُسی بس میں بیٹھا رہا۔ مگر گوجرانوالہ کی زمین پر پاؤں رکھتے ہی مدن کے دل میں بوا کی محبت چھلک اٹھی، اور اس کے پاؤں یکایک اس گھر کی طرف اٹھ گئے، جہاں اُسے اپنے دودھ پر پالنے والی اس کی بوا رہتی تھی.....

مدن نے بچپن میں کبھی وہ گیت سُنا تھا، جس میں ایک جوان بیٹا سنیاسی ہونے لگتا ہے اور ماں اس کے گیروے چوغے کا دامن تھام کر روتی ہے ——— "رے میرے دودھ کا قرض چُکا تھا۔"

مدن کے پاؤں تھم سے گئے۔ زمین کی ماٹی اٹھا کر ماتھے سے چھوائی اور دھیرے سے کہا ——— "تمہارے دودھ کا قرض میرے سر پر رہے گا، بوا ——— پہلے اِس دھرتی ماں کا قرض چکا آؤں........"

اور مدن نے اپنے پیر ایک بازار کی طرف موڑ لئے۔ جہاں سے اُس نے کالے پھندنے والی ایک لال رنگ کی ٹوپی خرید کر سر پر پہن لی اور ساتھ ہی ایک چشمہ خرید کر آنکھوں پر لگا لیا اور پیدل تلونڈی کے راستے پر چل دیا۔

اُس نے وزیر آباد کی بس گوجرانوالہ سے نہیں، اس کے اگلے اسٹیشن تلونڈی سے پکڑی۔ لیکن جب وزیر آباد پہنچا تو شام اُتر آئی تھی۔ اُس وقت اگر سیالکوٹ کی بس مل بھی جاتی تو سیالکوٹ سے جموں جانے والی گاڑی نہیں پکڑی جا سکتی تھی۔

رات کاٹنی تھی، اس لئے جہلم جا رہی بس میں بیٹھ کر کوئی آدھی رات کے وقت جہلم پہنچ گیا، اور پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر سو گیا۔

صبح ہوئی تو اسٹیشن سے باہر جا کر ایک ڈھابے جیسے مسلم ہوٹل میں نہایا بھی، چائے بھی پی، اور پھر بازار میں سے کاغذ پنسل اور ایک لفافہ خرید کر، جہلم دریا کے کنارے چلا گیا۔ گھر میں اپنے پتا کو اُسے اپنی خبر دینی تھی۔ سوچا کہ اُس کا خط اگر پولیس کے ہاتھ بھی لگ گیا، تو خط پر جہلم کی مہر ہو گی، اور اس کی کھوج اپنے آپ غلط راستے پر پڑ جائے گی۔ ....

ملن نے ماں کے لئے پر نام لکھ کر، پتا کو لکھا ——"آپ میرے انقلابی خیالات کو اور میرے جذبات کو بخوبی جانتے ہیں۔ اس لئے آپ کو میرے اٹھائے قدم پر حیرت نہیں ہو گی۔ لیکن آپ کو یہ جان کر دُکھ ہوا ہو گا کہ میں اپنی کمپنی والوں کا ڈیڑھ ہزار روپیہ چُرا کر بھاگ گیا ہوں۔ پتا جی، اگر میں نے یہ رقم اپنے لئے چرائی ہوتی تو مجھے چور سمجھنا واجب ہوتا۔ لیکن میں نے یہ رقم ایک آدرش کے لئے لی ہے، جو میرے لئے بہت ہی مقدس ہے۔ میرا یقین ہے کہ سرمایہ دار فطرتاً لٹیرا ہوتا ہے اور اُس کے جرم ہی لکشمی کو روشنی دکھانے والے چراغ ہوتے ہیں۔ مثلاً میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا، وہ کھدر دھاری ہیں اور گاندھی بھگت۔ لیکن وہ کیسے گاندھی بھگت ہیں، یہ تو مہاتما گاندھی ہی جانتا ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ آج جو دوائی وہ بتیس روپے میں بیچتے ہیں، تھوڑے دن پہلے، جنگ شروع ہونے سے پہلے وہ دو روپے کی ہوا کرتی تھی۔ ایسے لوگ لوٹ کو بیوپار قرار دیتے ہیں۔ آج میری یا دوسرے نوکروں کی تنخواہ میں تو ایک روپے کا بھی اضافہ نہیں ہوا ...... لہٰذا، اگر میں نے یہ روپیہ لیا ہے تو میں اسے جرم قرار نہیں دے سکتا۔ پتا جی، وقت بہت کم ہے اس لئے میں اپنے اُٹھائے قدم کے بارے میں تفصیل سے نہیں لکھ سکتا۔ بس یہی کہنا ہے کہ آپ کا ملن کبھی کوئی ایسا کام نہیں

کر ے گا، جس سے آپ کے مقدس نام اور عزت پر دھبہ لگے ...... "

اور مدن یہ خط ڈاک میں ڈال کر وزیر آباد جانے کے لئے بس میں بیٹھ گیا۔

وزیر آباد سے سیالکوٹ پہنچ کر مدن نے جموں جانے والی گاڑی کی ٹکٹ لے لی۔

راستہ خیر خیریت سے گزر گیا اور جموں پہنچ کر جب وہ مسلم ہوٹل تک پہنچا

—— دیکھا، ہوٹل کے پیچھے پر کھڑا ابھرا ایسا غلام محمد اس کا انتظار کر رہا ہے کیونکہ

وہ پہنچنے میں ایک دن پچھڑ گیا تھا۔

دونوں نے ہوٹل میں چائے پانی پیا، اور وہاں سے سری نگر کی بس میں بیٹھتے

ہوئے غلام محمد نے مدن کو بتایا کہ صفدر سری نگر میں ہے، شیخ عبداللہ کا مہمان۔

سری نگر پہنچ کر غلام محمد نے بتایا کہ وہ نیشنل کانفرنس کا ممبر ہے۔ اسی کانفرنس

کے دفتر میں جا کر اس نے مدن کو ایک کمرے میں بٹھا دیا اور خود صفدر تک خبر پہنچانے

کے لئے چلا گیا۔

مدن بڑی بے صبری سے صفدر کا انتظار کر رہا تھا، جس وقت ایک امام آیا،

جس کے ہاتھ میں تسبیح تھی، اور لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا وہ کچھ گنگنا رہا تھا...

مدن نے بے چینی سے پھر دروازے کی طرف دیکھا، تو وہ امام زور سے ہنس پڑا ——

"مدن ایڈیٹ! اٹھ کر گلے نہیں ملے گا؟"

اور مدن نے پہچانا —— وہ صفدر تھا۔ صفدر خوش ہوا کہ اگر میرا جگری دوست

مجھے نہیں پہچان پایا تو پولیس نہیں پہچان پائے گی.......

وہاں صفدر نے بتایا کہ وہ گوالمنڈی کے تھانے میں کس طرح فرار ہوا تھا۔

چھوٹا سا تھانہ تھا، ایک منزلہ —— جس کا غسل خانہ چھت پر تھا۔ رات کو صفدر نے

پہرے والے سپاہی سے کہا کہ اسے حاجت کے لئے جانا ہے۔ سپاہی اس کو چھت

پر لے گیا، تو صفدر نے چھت سے نیچے باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ سپاہی نے

شور مچایا، لیکن چھت سے چھلانگ لگا کر اُس کا پیچھا کرنے کی اُس کی ہمت نہیں پڑی۔ وہیں نزدیک ہی امرت دھارا کی بڑی سی فیکٹری تھی، جہاں صفدر نے پناہ لی فیکٹری کے مالک کا بیٹا صفدر کا سیاسی شاگرد تھا۔ اُس نے رات کو پناہ بھی دی اور صبح اُسے سیٹھوں، کارخانے داروں والے کپڑے پہنا کر اپنی گاڑی میں بٹھا کر کالا شاہ کاکو تک چھوڑ دیا۔ اور وہاں سے بسیں اور گاڑیاں پکڑتا ہوا وہ سری نگر پہنچ گیا۔۔۔۔۔

اُس دن صفدر نے مدن کو بتایا کہ گلگت کے راستے سے روس تک پہنچنے کا سیدھا راستہ تھا، لیکن شیخ عبداللہ نے آدمی بھیج کر خبر منگائی ہے کہ وہاں برطانوی فوج نے ناکہ بندی کی ہوئی ہے، وہاں تو چڑیا بھی پھٹکنے نہیں پاتی۔ اب دوسرا راستہ سرحدی علاقے کی طرف سے ہے۔ آزاد قبائلی علاقے کی طرف سے، جس کے لئے شیخ عبداللہ کی صلاح ہے کہ ہم پہلے ایبٹ آباد جائیں۔ وہاں سرحدی گاندھی کا ایک نزدیکی آدمی ہے ــــ حکیم عبدالسلام، وہ ہمارے لئے کوئی راستہ نکالے گا۔۔۔۔۔

نیشنل کانفرنس کے دفتر میں مدن کی صادق سے ملاقات ہوتی۔ مدن کو اپنے بازو پر کھدے ہوتے اپنے نام کی فکر تھی، جس سے پولیس اُس کا پتہ لگا سکتی تھی۔ اُس وقت محمد صادق نے کہا ــــ "میاں ہر دت! بازو پر پورا نام تو لکھا ہوا نہیں، صرف 'ایم، ایچ' لکھا ہوا ہے۔ اس سے اگر مدن موہن ہر دت بن سکتا ہے، تو میاں محمد حسین بھی بن سکتا ہے۔۔۔۔۔ صرف نماز پڑھنا سیکھ لو۔۔۔۔۔"

اور مدن نے اُسی وقت بازار جا کر خاکی کرتہ، لٹھے کی شلوار اور سات گز کی پگڑی خرید لی، ساتھ ہی پٹھانی چپل بھی۔

اُس رات شیخ عبداللہ کے کسی رشتہ دار کی شادی تھی، جہاں صفدر کو بھی بلایا تھا اور مدن کو بھی۔ اُس رات سات رنگا پلاؤ کھاتے ہوئے مدن اور صفدر لذیذ کھانے کا ذائقہ لیتے رہے اور اس ذائقے کو الوداع کرتے رہے۔۔۔۔۔

صبح ہوتے ہی دونوں بس سے ایبٹ آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر جب صفدر نے مدن کو کھیتوں میں بٹھا دیا اور خود شہر میں حکیم عبدالسلام کو ڈھونڈنے چلا گیا۔ تو مدن کھیت میں بیٹھ کر کاغذ پر لکھی ہوئی نماز یاد کرنے لگا......

جب صفدر لوٹ کر آیا تو حکیم صاحب اُس کے ساتھ تھے۔ جنہوں نے اپنے کھیت کی ایک کوٹھڑی کھول کر ان کی رہائش کا بندوبست کر دیا اور کہا ـــــ ”دوسرے کام میں کچھ دن لگ جائیں گے۔ اس لئے دیکھنے والوں کو کہا جائے گا کہ صفدر ہمارا ایک زمیندار ہے اور چھوٹے بھائی کو یہاں علاج کے لئے لے کر آیا ہے......“

مدن ہنس دیا ـــــ ”اب میں زمیندار صاحب کا چھوٹا بھائی ہوں، بیمار ـــــ لیکن میری بیماری کا نام بھی رکھ دیجئے۔ میں کاہے کا مریض ہوں ؟“

حکیم صاحب اُس کے دُبلے پتلے جسم کی طرف دیکھ کر ہنس دیئے اور بولے ـــــ ”مریض تپ دق کا، اور کاہے کا......“

اور مدن کھیت کی کچی کوٹھڑی میں بچھی چارپائی پر جب کھیس تان کر لیٹ گیا، تو اس کے ہونٹوں کی طرح کوٹھڑی کی دیواریں بھی ہنس دیں.... گنگنانے لگیں....

بال ناتھ نے سا۔ مَتے سد دھیدو، جوگ دِبن نوں پاس بہالیاسُو
کن پاڑ کے جھاڑ کے حِرص حسرت، اِک پلک وِچ مُنّ وکھالیاسُو

٦

ویسے تو حکیم صاحب روزانہ شام کو اپنے مریض کی حالت دیکھنے کے لئے صفدر اور مدن کی کوٹھڑی میں آجاتے تھے، لیکن جب دن میں کبھی دونوں کا شہر جانے کو دل کرتا، اُس کے لئے مدن نے تھوڑا تھوڑا کھانستے رہنے کی عادت ڈال لی۔ اس سے

مدن کے، مرعن، نے شہر کی عورتوں کا دل جیت لیا۔ ایک تو وہ بانکا جوان تھا، اس پر ترلشے ہوئے نقش، جب ہتھوڑا تھوڑا اُٹھاتا تو راہ چلتی کئی عورتیں اُسے دیکھ کر کھڑی ہو جاتیں دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہتیں ——— "یا اللہ! تو اس نوجوان بچے کو شفا دے دے۔ اس نے تو ابھی جوانی بھی نہیں دیکھی۔۔۔۔۔۔۔"

اور دونوں جب پانچ وقت کے نمازی بن جاتے، مدن اپنے دوست سے کہتا ——— "ان نمازوں کی ایک خوبی ہے کہ اس طرح سبھی ایک کنبے کی طرح روز مل کر بیٹھتے ہیں، ایک دوسرے کا دُکھ سکھ بھی سُن لیتے ہیں اور خدا کے روبرو ہو کر بھی بیٹھ سکتے ہیں۔"

اور ساتھ ہی مدن کہتا ——— "مگر ہم تو اسٹیج کے نائیک ہیں، وقت کے ناٹک میں نمازی کا کردار پیش کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔"

شام کو دونوں کا اصلی کردار صرف حکیم صاحب دیکھتے تھے، جب راستے کی مشکلیں وہ شطرنج کے کھیل کی طرح سامنے رکھ کر سوچنے لگتے تھے کہ اب آگے کون سا مہرہ چلنا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

حکیم صاحب نے قبائلی علاقے کی تاریخ اُن کو سمجھائی کہ وہاں صدیوں سے مختلف خان اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی ریاست بنا کر رہ رہے ہیں اور جن پر انگریز حکومت کبھی بھی مکمل اثر و رسوخ نہیں جما سکی۔ پھر کوئی سو سال ہو گئے ہیں، جب ہندوستان سے بھاگ کر آئے مسلم رفیوجی بھی وہاں آ بسے۔ اُن کی اور پٹھانوں کی آپس میں ہمیشہ لڑائی رہتی ہے۔ ہندوستانی رفیوجی زیادہ خطرناک ہیں ——— وہ علاقے میں سے گزرتے ہوئے آدمی کو لوٹ بھی لیتے ہیں اور اکثر مار بھی دیتے ہیں۔

حکیم صاحب نے تفصیل سے بتایا کہ سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے، جب رائے بریلی سے سید احمد کے مرید یہاں آئے تھے۔ سید احمد وہ شخص تھا جس نے جنگجو وہابی مہم کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ لوگ اپنے آپ کو مجاہد کہتے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد ہے کہ ہندوستان

ہیں خالص اسلام کو جنم دیا جاتے۔ وہ انگریزوں کو بھی اور پٹھانوں کو بھی دشمن مانتے ہیں۔ لیکن اب ان میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہے، ایک گروہ پنجابی مسلمانوں کا ہے، دوسرا بہاری مسلمانوں کا۔ سندھ دریا کے نزدیک امب شہر کے پاس پنجابی مسلمانوں کا بسیرا ہے اور ڈیورنڈ لائن سرحد کے بجوڑ علاقے چمرقند میں بہاری مسلمانوں کا۔ وہ بہار کے مسلمان اپنے آپ کو خالص مسلمان سمجھتے ہیں اور ہندوستان کو دارالحرب کہتے ہیں۔ کافروں کا ملک، کیونکہ وہاں غیر مسلم انگریزوں کی حکومت ہے۔ دونوں گروہ کئی بار میل ملاپ بھی کر لیتے ہیں کیونکہ دونوں کی مذہبی بنیاد ایک ہی ہے —— اسلامی فنڈامنٹیل ازم۔

مدن اور صفدر کو چونکہ وہ علاقہ پار کرنا تھا، اس لئے اُس علاقے کی سیاست سے تھوڑے سے پریشان ہوئے۔ لہذا حکیم صاحب نے صلاح دی کہ پنجابی گروہ چونکہ زیادہ خطرناک ہے، اس لئے اُس گروہ کے رہنما کو اعتبار میں لانا ہوگا۔ وہ 'بادشاہ' کہلاتا ہے۔ وہ اور اس کا بیٹا 'شہزادہ'، دونوں انگریزوں کے پٹھو ہیں، لیکن دونوں موقع پرست ہیں۔ اس لئے اگر انہیں یقین دلایا جائے کہ ان کی مدد انہیں بہت منافع دے گی، تو ان کی وفا خریدی جا سکتی ہے......

اور حکیم صاحب نے یقین دلایا کہ صفدر اور مدن اگر کسی طرح یہ کر پائیں، تو آگے وہاں ایک آدمی ہے —— محمد حسین، جو انقلاب پسند ہے۔ اُس کی مدد سے وہ افغانستان کے شہر جلال آباد تک پہنچ جائیں گے۔ پھر وہاں ایک ہندوستان کا آدمی ہے —— حاجی محمد امین، جو انہیں افغان روس سرحد پر پہنچا دے گا.......

لگ بھگ بیس دن کے صلاح و مشورہ کے بعد، جب روانگی کا وقت آیا تو حکیم صاحب نے ایک سرحدی جوان محمد اسمٰعیل کو رہنما کے طور پر اُن کے ساتھ بھیج دیا اور خود سندھ دریا کے کنارے تک الوداع کرنے کے لئے آئے۔ ساتھ ہی وعدہ کیا کہ جب وہ خیریت سے افغانستان میں پہنچ جائیں گے، تو خبر ملنے پر وہ ایم۔ این۔ رائے تک یہ خبر پہنچا دیں گے۔

سندھ دریا زیادہ بڑا نہیں تھا، لیکن گہرا تھا اور تیز رفتار تھا۔ اس لئے حکیم صاحب نے ان کے لئے کشتی کا انتظام کر رکھا تھا۔ تینوں نے دریا پار کیا۔ آگے کنارے کنارے دریا کی چڑھائی کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ دوری پر برٹش پولیس کی چوکی آنے کو تھی، لیکن محمد اسمٰعیل نے بتایا کہ کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔ محمد اسمٰعیل شمال مغربی سرحدی صوبے کی انڈر گراؤنڈ قومی آزادی لہر کا کارکن تھا، لیکن ہندوستانی رفیوجی کے طور پر، اس کا قبائلی علاقے میں آنا جانا رہتا تھا، جس سے پولیس چوکی کے آدمی اُسے پہچانتے تھے۔

ویسے بھی وہ چھوٹی سی چوکی تھی، کوئی تین مربع گز میں ایک معمولی سے کمرے کی صورت میں بنی ہوتی، جہاں پولیس کے صرف دو آدمی تھے۔ محمد اسمٰعیل، صفدر اور مدن کو پرے کھڑا کر کے، پانچ منٹ کے لئے چوکی کے اندر گیا اور باہر آکر اُس نے دونوں کو ہاتھ سے اشارہ کر دیا کہ وہ دونوں اُس کے پیچھے پیچھے چل دیں۔

اگلا راستہ بڑا پتھریلا تھا، جس کے دائیں طرف سندھ دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور بائیں طرف اونچا پہاڑ تھا جو آسمان کو ہاتھ سے چھو رہا لگتا تھا۔ مگر لگ بھگ تین میل کے بعد یہ راہ اور بھی دشوار ہو گئی، کیونکہ راستے کے پتھر اس طرح چکنے ہو گئے، جیسے کسی کاریگر نے رندہ پھیر کر بچھائے ہوں یہ راستہ تھا جہاں مدن کی پٹھانی چپلیں پھسلنے لگی تھیں اور اُسے لگا کہ پاؤں پھسل کر اگر طوفانی دریا میں جا پڑا، تو یہی پانی اُسے گنگا اشنان کروا دے گا.......

مدن نے چپلیں اُتار کر بغل میں دبا لیں، تو کڑکتی دھوپ سے تپتے ہوئے پتھر اُس کے پاؤں جھُلسنے لگے۔ اُس وقت مدن نے صفدر کا بازو جھنجھوڑ کر کہا ــــ "یار! سندھ کے اس طوفانی پانی نے ہمارے عشق کے طوفانی پانی سے شرط لگا رکھی ہے یہ بھی سلامت رہے لیکن اسے کیا پتہ کہ ہمارے دلوں کا طوفانی پانی اس کے آگے ہارے گا نہیں...."

سورج ڈھلنے لگا تھا ــــ جس وقت سامنے ایک چھوٹا سا میدان دکھائی دیا، اور

محمد اسمٰعیل نے کہا کہ وقت ہو گیا ہے، آؤ یہاں بیٹھ کر نماز پڑھ لیں۔

وہ ہموار جگہ سچ مچ نماز گاہ تھی، کیونکہ وہاں مٹی کا ایک لوٹا بھی پڑا ہوا تھا، وضو کرنے کے لئے۔ یہ بے در و دیوار عبادت گاہ تھی، راستے کے مسافروں کے لئے اور یہاں ربیا سے جدائی کی اجازت سے لے کر ان تینوں کو بائیں طرف کی وہ پگڈنڈی پکڑنی تھی جو ایک سخت چڑھائی کی شروعات تھی......

اب پگڈنڈی کے دونوں طرف پہاڑ تھے، جن کی ہریالی سے، کرنوں نے مُنہ موڑ کر سیاہی بکھیر دی تھی اور مدن کے پاؤں تھم گئے ——— دائیں طرف، پہاڑ کے پیروں میں ایک پہاڑی نالہ اس طرح پھر رہا تھا، جیسے ایک بہت بڑا اژدہا زور زور سے پھُپھکارتا ہوا سارے پہاڑ کے پیروں سے لپٹ گیا ہو......

مدن کی آنکھیں اُوپر پہاڑ کی چوٹی کی طرف اٹھیں، تو اُس نے اس دہشت کا حُسن پہچانا۔ تصور کیا کہ وہ چوٹی کے اُوپر سے اس نیچلی پگڈنڈی کے مسافروں کو دیکھ رہا ہے، جو تین چھوٹے چھوٹے ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں......

قدرت کے اس بے مثال حُسن نے جب مدن کو گلے سے لگا لیا، تو مدن کے دل میں تاریخ کا وہ منظر تڑپ اُٹھا، جب انسان کی آنکھوں میں اس حُسن کی پہچان آ جائے گی اور وہ نہ کسی کا غلام رہنا چاہے گا اور نہ کسی کو غلام بنانا چاہے گا......

۷

سُورج قریب قریب ڈوب چکا تھا، جب راستے کے بسیرے والا گاؤں سامنے آیا۔ مشکل سے چار پانچ گھر پٹھانوں کے تھے، لیکن ان میں سے ایک محمد اسمٰعیل کے دوست کا تھا، جس نے حقیقی خوشی سے انہیں خوش آمدید کہی۔ پٹھانی نان اور گوشت کے شوربے

بھرے ہوئے پیالے سامنے رکھے۔ پہاڑی سفر کی تھکاوٹ سے جب وہ سر کے نیچے تکیے لگا کر چٹائیوں پہ لیٹنے لگے تو میزبان نے پشتو زبان میں شب بخیر جیسا کچھ کہا جس کے معنی محمد اسمٰعیل نے سمجھائے کہ سر کے نیچے بازو رکھ کر غموں سے آزاد ہونے کی یہ دُعا ہے...

یہ دُعا مدن کو شوربے کے پیالے سے بھی زیادہ لذیذ لگی، اور سونے کے وقت اُس کا ذائقہ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں گھلتا رہا......

تڑکے کی نماز ادا کر کے اور نمکین چائے پی کر وہ تینوں چل دیئے۔ دوپہر کوئی دو بجے کا وقت تھا کہ وہ مٹی کی چار دیواری والے اُس قصبے میں پہنچ گئے، جہاں 'بادشاہ' سے ملنا تھا۔ اس مٹی کی قلعہ بندی سے باہر ایک مسجد تھی، جہاں انہوں نے قیام کیا۔ صفدر اور مدن کو وہاں چھوڑ کر محمد اسمٰعیل 'بادشاہ' کے آگے درخواست کرنے گیا کہ ہندوستان سے آئے ملاقاتیوں کو وہ ملاقات کا موقع عطا فرمائیں......

آزاد قبائلی ہوا کی طرح یہ خبر سارے قصبے میں پھیل گئی کہ دو مولانا ہندوستان سے آئے ہیں۔ ادھیڑ عمر اور بوڑھے مرد مسجد کی طرف آنے لگے تو مدن عرف میاں محمد حسین جلدی سے سنجیدہ صورت بنا کر تسبیح پھیرنے لگا تاکہ وہ لوگوں کی پوچھ تاچھ والی بات چیت سے بچا رہے........

کچھ ہی دیر بعد اسمٰعیل نے آ کر خبر دی کہ 'جہاں پناہ' نے ملاقات کی اجازت فرمائی ہے۔

وہ تینوں جب قلعہ بندی جیسی چار دیواری میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ مٹی سے بنی ایک ایک کوٹھری والے کوئی چالیس گھر تھے، جن کے ایک سرے پر پکی اینٹوں والا ایک منزلہ 'محل' تھا۔ اندر بیٹھک میں قالین بچھی ہوئی تھی، جس پر ایک تکیے کی ٹیک لگا کر 'بادشاہ' بیٹھا ہوا تھا، اور دونوں طرف خدمت گار دست بستہ کھڑے تھے.....

تینوں نے جھک کر السلام علیکم کہا تو بادشاہ نے دونوں ہاتھ چھاتی پر رکھ کر

تھوڑی سی گردن جھکائی اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا۔۔۔۔۔اس کا دوسرا اشارہ خدمت گاروں کے لئے تھا، جو بیٹھک سے باہر چلے گئے اور ایک دوسرا خدمت گار انگوروں اور سیبوں سے بھرا ہوا تھال لاکر مہمانوں کے سامنے دسترخوان بچھاکر رکھ گیا۔

بادشاہ کی عمر کوئی ساٹھ یا سٹھ سال کی لگتی تھی۔ اُس کے گول چہرے پر سفید داڑھی تھی، لیکن سفید پگڑی میں ایک ہیرا سا لگا دیکھ کر مدن کو وہ جادوگر یاد آگیا، جس کا کھیل دیکھنے کے لئے وہ ایک بار لاہور کے سینما گھر میں گیا تھا۔ رسمی دعا سلام کے وقت بادشاہ کے لہجے میں شائستگی تھی، لیکن آنکھوں میں اتنی مکروہائی کہ مدن کو لگا —— وہ نگاہوں سے اُن کی چھاتی میں چھپے خوابوں کا جائزہ لے رہا ہے۔

صفدر تجربہ کار اور سنجیدہ آدمی تھا، اس لئے مدن کی طرح اس کی نگاہوں میں کوئی بے تابی نہیں تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق جب اسمٰعیل انگوروں کے چار چھ دانے کھانے کے بعد بیٹھک میں سے باہر چلا گیا، تو صفدر نے بات شروع کی ——

"جہاں پناہ، انڈین نیشنل کانگریس نے ہم دونوں کو ایک خاص مقصد سے اس علاقہ میں بھیجا ہے اُس کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں آپ جیسے ہندوستانی حب الوطنوں کی مدد چاہیئے۔ ہندوستان چھوڑتے وقت آپ کے بزرگوں نے بے مثال حوصلے اور ہمت کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کیا تھا —— پھر آپ کی رہنمائی میں عوام نے بہادری سے ظالم اور جابر انگریزوں سے لڑائی جاری رکھی۔ ان حقیقتوں کی روشنی میں کانگریس کو صرف آپ کی مدد پر بھروسہ ہے۔۔۔۔۔۔"

جواب میں بادشاہ نے حلیمی سے کہا "آپ نے ہمارے شاہی خاندان کی تعریف میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کے لئے ہم تہ دل سے مشکور ہیں۔ ہمیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ ہمارے مادرِ وطن ہندوستان نے ہمارے شاہی خاندان کی قربانیوں کو اور حب الوطنی کو بھلایا نہیں لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی

کہ ہم نیشنل کانگرس کا ساتھ کس طرح دے سکتے ہیں۔ گاندھی عدم تشدد میں یقین رکھتا ہے۔ جب کہ ہمارے یقین کی بنیاد تشدد اور جہاد پر ہے۔"

صفدر نے اُس سے بھی زیادہ حلیمی سے کہا ——— "جہاں پناہ، آپ جہاں دیدہ سیاستداں ہیں، اس لئے آپ جانتے ہیں کہ سیاست کے میدان میں داؤ پیچ بدلتے رہتے ہیں۔"

بادشاہ نے حامی بھری ——— "بجا فرماتے ہیں، آپ۔ کیونکہ سرحدی گاندھی، خان عبدالغفار خان اگرچہ اپنے آپ کو عدم تشدد کا حامی ظاہر کرتا ہے، لیکن ہے تو پٹھان ہی، جب کہ پٹھان کے پاس کھانا ہو یا نہ ہو، اُس کے پاس ہتھیار ضرور ہونا چاہیئے....."

"میری گزارش ہے......"، صفدر کچھ کہنے جا رہا تھا کہ بادشاہ نے کہا ———

"بہر حال دو دنوں تک شہزادہ صاحب پشاور سے تشریف لا رہے ہیں وہ فیصلہ کر سکیں گے کہ آپ کے مقصد کے لئے کہاں تک مدد کی جا سکتی ہے۔ ہم تو اپنی سلطنت کی حکومت کے کام کاج سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ اب اس کام کی باگ ڈور ہمارے جانشین شہزادہ صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو، ہم ربّ العالمین کی عبادت میں دن رات گزارتے ہیں....."

اور ساتھ ہی بادشاہ نے افسوس ظاہر کیا کہ معزز مہمانوں نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی، ورنہ اُن کے سفر کے لئے گھوڑوں کا انتظام کر دیا جاتا......

اُس وقت ایک خدمت گار نے مہمانوں کے سامنے بریانی، کوفتے کے شوربے سے بھرے پیالے، بھنا ہوا گوشت، آلو کا رائیتہ اور رومالی روٹیاں لا کر دسترخوان سجا دیا۔ اور بادشاہ کے اصرار پر انہوں نے کھانا کھا لیا۔

شام کی نماز کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس لئے بادشاہ کا شکریہ ادا کر کے وہ دونوں مسجد کی طرف چل دیئے۔ وہاں محمد اسمٰعیل ان کا انتظار کر رہا تھا کہ ملاقات کا قصّہ سن کر وہ لوٹ سکے۔ لیکن دونوں نے اُسے شہزادہ صاحب سے ملاقات کے

نتیجہ کا انتظار کرنے کے لئے روک لیا، تاکہ وہ لوٹ کر حکیم عبدالسلام کو سفر کے پورے نتیجے سے واقف کرا سکے۔

اتنے میں گاؤں کے لوگ بھی مسجد میں آنے شروع ہو گئے اور جب وہ تین چار قطاروں میں کھڑے ہو گئے تو امام نے صفدر کو دعوت دی کہ وہ نماز کی رہنمائی کرے۔ اُس وقت مدن نے کچھ گھبرا کر صفدر کی طرف دیکھا، وہ جانتا تھا کہ اس معاملہ میں صفدر کا حال بھی مدن جیسا ہے لیکن صفدر نے بڑے اچھے طریقے سے وقت کو سنبھال لیا۔ کہنے لگا ——— "معزز بزرگوار امام صاحب کی موجودگی میں مَیں نماز کی رہنمائی کروں، اچھا نہیں لگتا........"

نماز کے بعد، جیسا بادشاہ نے کہا تھا، وہ تینوں شاہی باغ، دیکھنے کے لئے چل دیئے۔ وہ باغ پہاڑی نالے کے کنارے پر تھا، بس یہی اس کی شاہانہ تشریح تھی یا یہ کہ وہاں شاہی خاندان کے سوا کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ تینوں نے پہاڑی نالے میں غسل کیا اور مسجد کی طرف لوٹ پڑے۔

اتنے میں ایک خدمت گار آیا کہ اُن کے لئے بستر بچھا دیئے گئے ہیں۔ تینوں اُس خدمت گار کے پیچھے پیچھے جب ایک مکان کی چھت پر پہنچے، تو دوسرا خدمت گار ان کے لئے دودھ کے بھرے ہوئے تین بڑے گلاس لے کر حاضر ہوا.........

اس خاطر داری کے بعد دوسرے دن جب تینوں دارالحکومت دیکھنے کے لئے گاؤں کی گلیوں میں گئے تو مدن نے دیکھا کہ زیادہ تر لوگ پنجابی ہیں اور تنگ گلیوں میں ان کا رہن سہن کسی بھی عام پنجابی گاؤں جیسا ہے۔ وہاں مدن نے لوگوں کے ساتھ بات چیت کی۔ کسی نے بتایا کہ وہ ایک ہیبت ناک جرم کر کے ہندوستان سے بھاگ آیا تھا۔ کسی نے بتایا کہ وہ ایک ڈاکے کے سلسلہ میں فرار ہو کر بادشاہ سلامت کی پناہ میں آیا تھا.......... اور اس طرح کی داستانیں سُن کر مدن کو یقین ہو گیا کہ

سارے کا سارا گاؤں ڈاکوؤں اور قاتلوں کا ہے اور یہی ڈاکہ زنی ان کا پیشہ ہے.........

اُس رات مدن کو اتنے بھیانک سپنے آتے رہے کہ اُس نے کئی بار ساتھ کی چارپائی پر سو رہے صفدر کو ٹٹول کر دیکھا........

خیر، تیسرے دن دوپہر کی نماز کے بعد ایک خدمت گار نے آکر اطلاع دی کہ عالی جاہ شہزادہ صاحب پشاور سے تشریف لے آئے ہیں اور انہوں نے ملاقات کی دعوت عنایت فرمائی ہے.......

وہ بھی ایک منزلہ عمارت تھی لیکن بیٹھک بہت بڑی تھی، چار بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیوں والی۔ فرش پر نہایت خوبصورت ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں شیشم کی لکڑی کا میز تھا، جس پر ریڈیو سجا ہوا تھا اور عین درمیان میں نو انچ اونچائی والی تین فٹ چوڑائی اور چھ فٹ لمبائی کی چوکی تھی، جس پر دسترخوان بچھا ہوا تھا....

مدن کے دل میں ایک عجیب مشابہت آئی کہ ایک دن پہلے اُس نے دارالحکومت میں قتل و خون کی بُو دیکھی تھی، وہی بو اس بیٹھک عطر سے بھگو دی ہے۔ شہزادہ صاحب کے لباس پر اتنا عطر چھڑکا ہوا تھا کہ ساری فضا عطر میں بھیگی ہوئی لگتی تھی........

تیس پینتیس برس کے شہزادے کے سر پر کلے دار مشدّی لنگی تھی، کمر پر لٹھے کی بھاری شلوار اور گلے میں گہرے سرخ رنگ کی پٹھانی طرز کی بٹنوں والی واسکٹ جس کے سامنے والی چھوٹی جیب میں سے ریشمی رومال کے رنگین پھول دار کونے نے سانپ کے پھن کی طرح سر اٹھایا ہوا تھا.......

دُعا سلام کے بعد رسمی سی بات چیت میں فریقین ایک دوسرے کا جائزہ لیتے رہے۔ دسترخوان کئی طرح کے لذیذ کھانوں سے سجا دیا گیا اور اس دوران شہزادہ صاحب

نے طے کیا کہ اگلی ملاقات شام کو چھ بجے ہوگی۔

چھ بجے والی ملاقات میں پھلوں کے رس سے بھرے پیالوں کی خاطر داری قبول کرتے ہوئے صفدر نے وہ سبھی باتیں دہرائیں جو تین دن پہلے بادشاہ کے آگے پیش ہوئی تھیں اور ساتھ ہی کہا ـــــــ

"شہزادہ صاحب، انڈین نیشنل کانگریس واحد سیاسی پارٹی ہے اور اس کی اقتصادی حالت بہت مضبوط ہے۔ وہی انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے جانبازوں نے فیصلہ کیا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی میں عدم تشدد والے راستے کے ساتھ ساتھ دوسرا راستہ بھی اپنایا جائے تاکہ انگریز کے ساتھ فیصلہ کن ٹکر لی جا سکے۔ اس وقت برطانیہ جنگ میں اُلجھ چکا ہے، اس لئے سیاسی حقیقت کا فائدہ اُٹھانا چاہیئے ـــــ آج ہندوستان میں ایسے سیاسی حالات پیدا ہو چکے ہیں کہ اگر مسلح بغاوت کی جائے تو ہندوستانی فوج کا کافی بڑا حصّہ ہماری ہتھیار بند بغاوت کا ساتھ دے گا۔ حضور متفق ہوں گے کہ انگریزی حکومت کے خلاف مسلح جنگ کی تیاری اور تنظیم کی شروعات کے لئے آزاد قبائلی علاقہ بہترین جگہ ہے......"

شہزادہ صاحب نے بڑی چالاکی سے پوچھا ـــــ "یہ بتلایئے کہ اس سلسلے میں آنریبل جناب محمد علی جناح صاحب کی کیا رائے ہے؟"

صفدر نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا ـــــ "اس آخری فیصلہ کُن لڑائی میں اگر مسلم لیگ ہمارا ساتھ دے تو اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں۔ بہت سے مسائل خود بخود ہی حل ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کی حب الوطنی بحث کی محتاج نہیں۔ نمایاں مثال کی ضرورت ہو بھی، تو حضور، آپ کے باعظمت شاہی خاندان کی قربانیاں حب الوطنی کی زندہ شہادت ہیں......"

مدن نے غور سے دیکھا کہ صفدر کے لفظوں "باعظمت شاہی خاندان" نے فضا میں ملی ہوئی عطر کی مہک کے ساتھ ایک جادو بھی ملا دیا ہے اور شہزادہ صاحب کا چہرہ دسترخوان کے سیب کی طرح چمکنے لگا ہے ....

پوچھا گیا ـــــ "مسلح کارروائی کی تنظیم کے سلسلے میں آزاد قبائلی علاقے کو استعمال کرنے کے لئے کوئی تیار شدہ منصوبہ ہے؟"

مدن اس علاقے کے پہاڑوں کی طرح خاموش تھا، لیکن صفدر کے ہونٹوں پر پہاڑی ہوا کی طرح لفظ سرسرائے ـــــ "بے شک تیار ہے، حضور۔ اب جب آپ کی اصولی طور پر رضامندی حاصل ہوگئی ہے، تو میں محسوس کرتا ہوں کہ اس موضوع پر میں تبادلہ خیالات کرسکتا ہوں۔ مشن کا مقصد ہے کہ پہلے قدم کے طور پر آپ کے علاقے میں کم از کم دو فیکٹریاں چالو کی جائیں، جہاں ہتھیار بنائے جاسکیں۔ ایک فیکٹری غالباً ہندوستان کی سرحد سے پاس ہوسکتی ہے، دوسری افغان سرحد کے پاس۔ آپ کی رہنمائی میں ملٹری ٹریننگ کیمپ کھولے جاسکیں گے۔ ہمارے مسلح حملے کا سب سے پہلا نشانہ شہر پشاور ہوگا اور پھر شمالی مغربی سرحدی صوبے کے دوسرے بڑے شہروں میں موجود برطانوی سرکار کے ملٹری اسٹورز اور ڈپوز ہوں گے۔ اس طرح ہماری ہتھیار بند جدوجہد آزادی سارے ہندوستان میں پھیل جائے گی۔"

اور صفدر نے حلیمی سے لیکن وزنی لفظوں میں کہا ـــــ "شہزادہ صاحب اس کام کے لئے آپ کو جتنی بھی رقم کی ضرورت پڑے گی، چاہے جتنی بھی رقم کی، اس کے انتظام میں کوئی شبہ نہیں ہے۔"

مدن کے لئے صفدر کی اس پیشکش کے لفظ اجنبی نہیں تھے، یہ سبھی کچھ دونوں نے حکیم صاحب کی صلاح سے ایبٹ آباد میں سوچا ہوا تھا۔ لیکن صفدر نے جس خوبی سے یہ بات پیش کی، شہزادہ صاحب کے چہرے پر تو رونق آنی ہی تھی، مدن کو بھی

محسوس ہوا کہ دراصل اسی بات پر عمل ہونا چاہیئے ۔۔۔۔۔۔

اس ملاقات کے آخر میں فیصلہ ہوا کہ عبداللہ صفدر صاحب اور میاں محمد حسین صاحب (مدن) دونوں آزاد قبائلی علاقے کا معائنہ کریں، ساتھ ہی وہ افغان سرحد کے پاس والی "شہزادہ صاحب" کی سلطنت کا بھی معائنہ کریں تاکہ ان کی واپسی کے بعد اس منصوبے کے تمام پہلوؤں کی روشنی میں کوئی ٹھوس قدم اٹھایا جا سکے۔

شہزادہ صاحب نے خبردار کیا کہ کسی حالت میں بھی کسی شخص کو اس منصوبے کی خبر نہیں ہونی چاہیئے ۔ چمرقند کے حاکم محمد لطیف کے آگے بھی اس کا ذکر نہیں آنا چاہیئے۔

رات کی دعوت کے وقت شہزادہ صاحب کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ اس لئے سونے کے وقت دونوں نے یہ سارا قصہ محمد اسمٰعیل کو سُنا دیا تاکہ صبح وہ ایبٹ آباد لوٹ جائے اور حکیم صاحب کو خبر دے سکے۔ اگلے دن روانگی کی تیاری ہوئی تو دونوں کے لئے گھوڑے بھی حاضر تھے اور ان کی حفاظت کے لئے محمد زماں کی رہنمائی میں چھ ہتھیار بند جوان بھی۔

مدن نے گھوڑے کی رکاب پر پیر رکھا، تو اُسے لگا ـــــ آج وہ جنگل، بَن اور پربت چیر کر، اپنے ملک کی، سو سال سے سوچی ہوئی آزادی کی پری کو جگانے چلا ہے ۔۔۔۔۔

۸

عوامی کہانیوں کا شہزادہ، جب سو سال سے سوئی ہوئی شہزادی کو جگانے جاتا ہے تو جس طرح راستے میں اُسے بھانت بھانت کی الائیں بلائیں ملتی ہیں، جن سے وہ حیرت بھی کھاتا ہے اور جنھیں جیت کر وہ قلعے میں قید شہزادی کے پاس پہنچنے کے

لئے آگے بھی بڑھتا ہے، کچھ اُسی طرح کا سفر مدن اور صفدر کا سفر تھا۔

بادشاہ اور شہزادہ صاحب سے رخصت ہو کر جب دونوں محمد زماں اور چھ ہتھیار بند جوانوں کی حفاظت، میں آگے بڑھے، تو چوتھے دن مالاکنڈ ایجنسی نامی علاقے میں پہنچے۔ جہاں برطانوی حکومت کا انگریز آفیسر رہتا تھا اور اس کی حفاظت کے لئے ایک پوری پلٹن تھی، جس کے سپاہی تو ہندوستانی تھے لیکن کیپٹن اور میجر جیسے آفیسر انگریز تھے۔ پتہ چلا کہ اس برٹش ایجنسی کا کام بندر بانٹ سیاست ہے، جو مختلف آزاد قبیلوں میں آپسی نفرت اور دشمنی بنائے رکھتی ہے......

اس مالاکنڈ ایجنسی سے اگلا علاقہ ایک اور قبیلے کا تھا، جہاں پہنچنے پر سورج ڈوبنے کا وقت ہو آیا تھا۔ مگر محمد زماں نے جب اُس قبیلے کے حاکم خاں کا دروازہ کھٹکھٹایا، تو وہ خان، محمد زمان سے گلے لگ کر ملا۔ محمد زماں نے صفدر اور مدن کا تعارف کروایا کہ وہ عالی جاہ شہزادہ صاحب کے خاص دوست ہیں اور چمرقند کے علاقے کی سیر کے لئے جا رہے ہیں۔ وہاں خان نے سبھی مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

اُس سے اگلا پڑاؤ دیر نامی قصبہ تھا، کسی اور قبیلے کے خان کی رہائش گاہ۔ وہاں کی مسجد میں شام کی نماز ادا کرنے کے بعد محمد زماں، ساتھیوں کو مسجد میں چھوڑ کر قاضی سے ملنے گیا، جس نے شہزادہ صاحب کے دوستوں کی آمد کی اطلاع پا کر ملاقات کی دعوت دی۔ صفدر اور مدن نے جب قاضی صاحب کے پاس جا کر دعا سلام کی، تو دیکھا کہ قبیلے کے کچھ آدمی دودھ کے پیالے لئے آرہے ہیں اور کچھ شہد کے پیالے۔ پتہ لگا کہ مہمانوں کو ہر پیالے میں سے دودھ اور شہد پینا ہوگا، بھلے ہی تھوڑا سا چکھیں۔ مہمان نوازی کی یہ روایت مدن کے لئے ایک اچنبھا تھی۔

اُسی رات جس پٹھان کے گھر میں انہیں ٹھہرایا گیا، رات کے کھانے کے وقت پٹھان نے اپنی زندگی کی عجیب داستان سنائی کہ جوانی میں ڈاکہ زنی اور قتل اُس کے دو ہی

شغل تھے۔ لیکن اُسے ایک حسینہ سے محبت ہو گئی۔ حسینہ کے ماں باپ نے جب اُس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا، تو اُسے حسینہ کا پیغام ملا کہ اگر وہ ڈاکہ زنی سے توبہ کرنے کا وعدہ کرے تو ماں باپ کی چوری سے اُس کے ساتھ کہیں بھی جانے کے لئے تیار ہے۔ اُس نے وعدہ کر لیا۔ لیکن جس اندھیری رات کو وہ دونوں قبیلے میں سے غائب ہوتے، اُن کا سراغ پا کر اُن کا پیچھا کیا گیا۔ اُس وقت پیچھا کرنے پر گولیاں چلا کر وہ بچ سکتا تھا مگر اُس نے اپنا وعدہ نہیں توڑا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کو پکڑ کر لڑکی کے بال کاٹ کر اسے کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا، اور خود اُسے ایک گہرے گڑھے میں ڈال کر گڑھے کو ایک بڑے پتھر سے بند کر دیا گیا۔ دن میں ایک بار وہ پتھر اٹھا کر ایک نان اور پانی کا لوٹا گڑھے میں رکھ دیا جاتا تھا اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ تو اُسے گڑھے میں سے نکال کر قاضی کے سامنے پیش کیا گیا، جس کے سوالوں کے جواب میں اُس نوجوان نے صدق دلی سے عرض کیا کہ محبت خدا کی نظر میں گناہ نہیں ہے۔ ماضی میں اُس نے جو گناہ کئے تھے، اُس کی سزا اُس نے گڑھے میں رہ کر پوری کر لی ہے۔ اس پر قاضی کے دل میں خدا کا خوف آ گیا اور اس نے کوٹھڑی میں بند حسینہ کو اس کی رضامندی کے بارے میں پچھوا بھیجا۔ اُس کا جواب آیا کہ وہ اپنے محبوب کے بنا زندہ نہیں رہے گی۔ تب قاضی نے لڑکی کے ماں باپ کو حکم دیا کہ وہ لڑکی کا نکاح اس نوجوان کے ساتھ کر دیں۔

جب مدن نے یہ جانا کہ اُن کے لئے آج کا کھانا اس پٹھان کی اُسی محبوبہ بیوی نے تیار کیا ہے، تو مدن نے کچھ روپے نکال کر اس نیک دل عورت کی نذر کرنا چاہے۔ پٹھان کو مہمان سے کوئی بھی پیسہ لینا واجب نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن مدن کو وہ رات ایک مقدس جگہ کی طرح لگ رہی تھی، جہاں اُسے کوئی نیاز ضرور چڑھانی تھی۔ اس لئے تحفے کی صورت میں وہ روپے اس طرح پیش کئے کہ اُس پٹھان کو قبول کرنے پڑے۔

اگلے دن صبح کی نماز پہاڑی نالے کے کنارے پر ادا کر کے سبھی نے لکڑی کا پل پار کیا اور تمام دن کے سفر کے بعد ایک گاؤں میں رات گزاری۔ اب اگلے دن انہیں پٹھانی علاقے میں داخل ہونا تھا، جہاں کے لوگوں کی روایات، رسم و رواج اور طرزِ فکر میں افغانی اثر نمایاں دیکھتا تھا۔ پتہ لگا کہ پٹھانی علاقے میں پچھلے دنوں ہندوستان کا ایک سید مُلّا گیا تھا تب سوکھا پڑا ہوا تھا، اس لئے لوگ اس کے پاس یہ سوال لے کر گئے کہ خدا کو کس طرح راضی کیا جا سکتا ہے؟ سید مُلّا نے کہا کہ وہ ہر جمعہ کو گھی کے چراغ جلا کر کسی پیر کی قبر پہ رکھا کریں اور بارش کے لئے دُعا کیا کریں۔ خدا چاہے گا تو فصلیں بہت اچھی ہوں گی۔ گاؤں کے لوگ مل کر سوچنے لگے کہ چراغ تو جلالیں گے لیکن ہمارے گاؤں میں کسی پیر کی قبر نہیں ہے، ہم وہ چراغ کس کی قبر پہ رکھیں گے؟ اور کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجہ پہ پہنچے کہ گاؤں میں آئے اس سید مُلّا سے بڑھ کر کوئی نیک بندہ نہیں ہے اس لئے انہوں نے مسجد میں سوئے ہوئے سید ملا کو مار دیا اور اُس کی قبر پہ ہر جمعہ کو چراغ جلانے لگے . . .

اور اگلے دن پٹھانی علاقے میں پہنچ کر مدن کی دہشت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ کہیں کوئی گاؤں نہیں ہے۔ ہر جگہ ایک ایک یا دو دو مینار والے چھوٹے چھوٹے قلعے ہیں اور انہیں میں قلعوں کے خان اور عوام رہتے ہیں۔ میناروں میں گول کھڑکیاں سی ہیں، جن میں سے دشمنوں پہ گولیاں چلائی جاتی تھیں۔ پتہ لگا کہ عام لوگوں کے پاس خود ساختہ بندوقیں ہوتی ہیں اور خانوں کے پاس بدیشی رائفلیں اور پستول۔ ایک قلعے کے خان کی دوسرے قلعے کے خان سے دشمنی عام بات تھی اور یہی دشمنی قابلِ فخر سمجھی جاتی تھی۔

یہاں مدن نے انگریزی حکومت کی ڈالی گئی پھوٹ ایک لعنت کی صورت میں دیکھی، جس نے لوگوں کا ایمان جیسا یقین بنا دیا تھا کہ مرد وہی ہوتا ہے جس کے بہت سے دشمن ہوں۔ جس کا کوئی دشمن نہ ہو وہ نامرد ہوتا ہے۔

اور چھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ سبھی خار کی خان کے مرکزی قلعے تک پہنچ گئے۔

وہاں مرکزی دروازے پر پہرہ دیتے ہوئے ہتھیار بند سنتری کو محمد زماں نے کہا کہ بڑے معزز لوگ تحصیل دار صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ کوئی دس منٹ کے بعد تحصیلدار صاحب باہر آکر محمد زماں سے گلے ملے، تو اُس نے صفدر اور مدن کا تعارف کروایا۔ "جناب عبداللہ صفدر صاحب اور جناب میاں محمد حسین صاحب، عالی جاہ شہزادہ صاحب کے جگری دوست ہیں۔ چمرقند کے علاقے کی سیر کے لئے جا رہے ہیں۔ سوچا کہ راستے میں آپ کا دیدار بھی حاصل کر لیں۔"

محمد زماں سچ مچ ہی ذہین آدمی تھا، بڑی خوبی سے سفر کا بندوبست کر سکتا تھا۔ پنجابی، اردو، پشتو تینوں زبانیں بخوبی جانتا تھا۔ تحصیلدار نے اُس کے تعارف پر دونوں مہمانوں کو دعا سلام کی اور کہا: "آپ نے مجھے مہمان نوازی کا شرف بخشا ہے۔ یہ آپ کی نوازش ہے۔ آپ کی تشریف آوری پر بندہ بے حد خوش ہے......"

اور اُس نے سبھی کو اندر بُلا کر پھل اور شربت پیش کیا۔

تحصیلدار کی مادری زبان پشتو تھی، لیکن وہ اُردو زبان بخوبی سمجھ بول سکتا تھا۔ عمر کوئی پینتیس برس کے قریب ہوگی۔ وہ خار کی خاں کا سب سے بڑا اصلاح کار تھا۔ اچانک مدن کو لگا کہ وہ تحصیلدار سے کوئی گہرا لگاؤ محسوس کر رہا ہے۔ مدن کچھ حیران سا کبھی نظر جھکا لیتا، کبھی پھر ایک بے بسی سے تحصیلدار کے چہرے کی طرف تاکنے لگتا اور پھر مدن کو احساس ہوا کہ اُس کا چہرہ تصویروں میں دیکھے ہوئے شیوا جی سے اِتنا ملتا جُلتا ہے کہ اسے دیکھے جانے کی وہ بے بسی سی محسوس کر رہا ہے۔

ساتھ ہی باتوں باتوں میں مدن نے محسوس کیا کہ جب تحصیلدار اُس کے بارے میں اور صفدر کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے کی کوشش کرتا ہے، تو محمد زماں بڑی ہوشیاری سے باتوں کا رُخ کسی دوسری طرف موڑ دیتا ہے۔ مگر اتنا مدن اور صفدر نے

بھانپ لیا کہ تحصیلدار فرار شدہ ہندوستانی کمیونسٹ محمد حسین کو ضرور جانتا ہے۔

ایک گھنٹے بعد تحصیلدار نے قلعہ سے باہر جا کر گھوم آنے کی تجویز پیش کی۔ مدن بولا ——— "بھائی جان! میں تو پہلے ہی یہ گزارش کرنے والا تھا۔" اس پر تحصیلدار ہنس دیا ——— "آپ تو خدا کے خاص بندے ہیں۔ لیکن اللہ نے مجھے بھی اتنی توفیق دی ہے کہ کسی کی حاجت کو جان لوں۔"

سب کے سب اُٹھ کر باہر جانے لگے تو صفدر نے مدن کو آنکھ سے اشارہ کیا جس سے مدن سمجھ گیا کہ اسے محمد زمان کو باتوں میں لگا کر ان دونوں کو کچھ دیر اکیلے میں چلنے کا موقع دینا ہے۔ اس موقع کے دوران صفدر نے باتوں باتوں میں تحصیلدار صاحب کو بتایا کہ ان کے بارے میں جو بتایا گیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ وہ اصل میں ہندوستان کے کامریڈ محمد حسین کے دوست ہیں۔

رات تحصیلدار کے گھر میں گزار کر، اگلی صبح وہ چمر قند کے راستے پر چل پڑے۔ راستے میں مدن کچھ پریشان تھا کہ صفدر کو تحصیلدار سے کامریڈ محمد حسین کا پتہ مل پایا ہے۔ کہ نہیں، لیکن وہ 'محافظوں' کی موجودگی میں صفدر سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔

سورج ڈوبنے کا وقت تھا جب وہ لوگ چمر قند پہنچے۔ 'شہزادے' کی افغان سرحد کے پاس والی 'سلطنت' کے کمانڈر محمد لطیف سے واقف کرواتے ہوئے محمد زماں نے وہی فقرے دوہرائے جو ہر جگہ کہتا آیا تھا لیکن مدن نے غور کیا کہ محمد لطیف 'شہزادے' سے کہیں زیادہ ہوشیار، پڑھا لکھا اور چالاک آدمی ہے۔ سبھی کو علاقے کی سیر کی دعوت دی تو مدن نے کہا کہ وہ ابھی وہیں آرام کرنا چاہے گا۔ اصل میں مدن کی نظر کمرے کی اُس الماری پر تھی، جس میں بہت سی کتابیں تھیں۔

وہاں مدن نے دیکھا کہ کتابوں میں اسٹالن کی سوانح عمری بھی ہے اور کمیونسٹ مینی فیسٹو بھی۔

مدن کا روم روم کھل اٹھا۔ جب صفدر واپس آیا، مدن نے موقع پاکر اُس پر اپنی خوشی اور تسلّی ظاہر کی۔ لیکن حیران ہوا کہ صفدر کا چہرہ اداس اور گمبھیر تھا۔ صفدر نے دھیرے سے کہا —— "دیکھو، یہ آدمی بہت خطرناک لگتا ہے۔ اس سارے جال سے ہمیں بہت ہوشیار رہنا چاہیئے۔"

مدن نے حیرت سے صفدر کا ہاتھ دبایا —— "پارٹی کے آدمی سے خطرہ!؟"

رات کو اکیلے میں صفدر نے کہا —— "میں نہیں مان سکتا کہ یہ حضرات کسی بھی آئیڈیلوجی کے پابند ہو سکتے ہیں۔ یہ لطیف، شہزادے سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ زیادہ پڑھا لکھا ہے۔"

مدن نے فکرمندی سے پوچھا —— "کیا خیال ہے کیا اب تک 'شہزادے' نے ہمارے بارے میں پشاور کے حاکم کو اطلاع کر دی ہو گی؟"

"نہیں" صفدر نے لمحہ بھر سوچ کر کہا —— "ان لوگوں کی وفاداری کی نیلامی میں جو شخص یا پارٹی سب سے زیادہ بولی دے، یہ اسی کے زرخرید ہو جاتے ہیں۔ ہم نے شہزادہ کے سامنے جو تجویز رکھی ہے، اُس کے لالچ میں شہزادہ اس وقت تک ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کرے گا، جب تک اُسے ثبوت نہ مل جائے کہ وہ صرف لفاظی تھی۔ مگر اب، ہمیں ان ہم سفروں سے کسی طرح چھوٹ جانا چاہیئے۔ میرے خیال میں واپس تحصیلدار تک پہنچنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری روانگی کے بعد اُس نے کامریڈ محمد حسین کے ساتھ ضرور رابطہ پیدا کیا ہو گا۔"

چمرقند پہنچتے ہی وہاں سے لوٹنا مناسب نہیں تھا۔ اس لئے تین دن بعد صفدر نے لوٹنے کی تجویز سامنے رکھی۔ ویسے اس دوران محمد لطیف کا رویہ ظاہری طور پر ٹھیک ہی تھا۔ لیکن مدن اور صفدر نے کئی بار محمد لطیف کو محمد زماں کے ساتھ سرگوشیاں کرتے ہوئے پایا تھا۔

اگلی صبح جانا طے ہوا تھا، اس لئے صبح کی نماز کے بعد دونوں نے پرُزور الفاظ میں محمد لطیف کا شکریہ ادا کیا اور اپنے 'رکھوالوں' کو ساتھ لے کر لوٹ پڑے۔

دونوں رات تک خاریں تحصیلدار کے پاس پہنچ جانا چاہتے تھے، لیکن شروع شام کو اُس کے ساتھ لگتے گاؤں میں پہنچے تھے، خارکی خان کے علاقے کی حد سے باہر، کہ محمد زماں نے رات وہیں رہنے کے لئے کہا۔ بتایا کہ وہ سب بہت تھک گئے ہیں۔

اُس رات جب کچھ کھا پی کر سب لیٹ گئے تو خدمت گاروں میں سے ایک صفدر کی ٹانگیں دبانے کے لئے آگیا اور ایک مدن عرف میاں محمد حسین کی۔ دونوں حیران ہوئے کہ اُن کی اس طرح خدمت آج کیوں کی جا رہی ہے......

اتنے دنوں کی تھکاوٹ کے بعد مدن کے بدن کو سُکھ مل گیا، لیکن فکر سے اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد مدن نے اُس 'خدمت گار' کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ اب جا کر سو جائے۔ مگر 'خدمت گار' کا کہنا تھا کہ جب تک وہ سُلا نہیں دے گا، تب تک دباتا رہے گا۔

مدن نے کچھ دیر بعد ظاہر کیا کہ وہ پوری طرح نیند میں ڈوب چکا ہے اور محسوس کیا کہ خدمت گار کے ہاتھ، پیروں اور پنڈلیوں سے اوپر اُٹھتے ہوئے اس کی کمر کو ٹٹول رہے ہیں۔ ظاہر تھا کہ اُس کے ہاتھ کھوج رہے تھے کہ آخر سارا پیسہ کس جگہ پر رکھا ہوا ہے...

مدن اس طرح جاگا، گویا اچانک گہری نیند سے جاگا ہو۔ زور سے کہنے لگا —— "بہت رات ہوگئی ہے۔ اب جا کر سو جاؤ۔"

صفدر کا بستر کمرے کے دوسرے سرے پر تھا، محمد زماں کے نزدیک اُس کی بھی اونچی آواز آئی —— "ہاں، ہاں۔ اب سب لوگ جا کر سو جاؤ۔"

محمد زماں نے چونک کر 'نیند' سے جاگتے ہوئے پوچھا —— "کیوں، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" صفدر نے جواب دیا، "بہت رات ہوگئی ہے۔ بس انہیں سونے کے

لئے کہہ رہا ہوں۔"

وہ لوگ چلے گئے، لیکن مدن اور صفدر ساری رات آنکھیں موند کر جاگتے رہے۔۔۔۔

۹

پَو پھٹنے کو تھی، جب صفدر نے دبے پاؤں اُٹھ کر مدن کا پیر جھنجھوڑا اور کمرے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ باہر سارا گاؤں گہری نیند سو رہا تھا۔ صرف آسمان پر ہلکی سی روشنی اُدگھ رہی تھی، جب دبی آواز میں صفدر نے کہا ــــــ "مدن! ظاہر ہے کہ ہماری رقم کی خاطر یہ لوگ ہمیں قتل کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ یہی بعد میں جا کر شہزادے سے کہہ دیں گے کہ راستے میں دونوں فرار ہو گئے تھے۔ میں ساری رات سوچتا رہا کہ ان سے کس طرح جان چھڑائی جائے۔ لہٰذا ایک تدبیر سوچی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور صفدر نے جب اپنی تدبیر مدن کے کان میں ڈال دی، تو دونوں دبے پاؤں آکر اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ پھر آسمان میں جب روشنی پھیلنے لگی، تو صفدر نے دھیرے دھیرے کراہنا شروع کر دیا۔ اتنے میں محمد زماں نے انگڑائی لی، تو اُسے بستر سے اُٹھتا دیکھ کر صفدر نے ٹوٹتی سی آواز میں اُس سے کہا ــــــ "زمان بھائی میری تو ہڈی ہڈی کسک رہی ہے۔ لگتا ہے کہ تیز بخار چڑھے گا۔۔۔۔۔۔۔"

مدن بھی گھبرایا سا صفدر کے پاس آکر اُس کا ماتھا ٹٹولنے لگا اور کہنے لگا ــــــ "بھائی جان، بہتر یہی ہوگا کہ ہم دو چار دن اسی گاؤں میں رہ جائیں۔"

محمد زماں نے جلدی سے مدن کی بات کاٹ کر کہا ــــــ "اس علاقے میں کوئی قابلِ حکیم نہیں ہے۔ اگر ہم جلدی سے جلدی شہزادہ صاحب کے پاس پہنچ جائیں تو ان کا حکیم، جناب عبداللہ صفدر صاحب کے مرض کی شناخت کر لے گا۔۔۔۔۔"

مدن نے اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا —— "آپ کا کہنا بجا ہے۔ اب نماز کے بعد اگر گھوڑوں کا بندوبست ہو جائے تو روانہ ہو جائیں گے۔۔۔۔"

شہزادے نے جو گھوڑے اُن کے سفر کے لئے پیش کئے تھے، وہ صرف اُسی علاقے کی حد تک اُن کے ساتھ رہے تھے۔ آگے وہ سارا سفر پیدل طے کرتے ہوئے آئے تھے۔

نماز کے بعد سب نے کچھ کھایا پیا، لیکن صفدر نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا۔ اس وقت مدن نے بڑی منت سماجت سے اُسے دودھ کا ایک گلاس پلا دیا، کہا —— "بھائی صاحب، بہت لمبا راستہ ہے، کچھ نہیں کھائیں گے تو اور کمزوری ہو جائے گی۔۔۔۔"

صفدر کی کراہٹ بڑھتی گئی تو مدن نے من میں کہا —— "آخر وہ میرا استاد ہے۔ مریض کا کردار بھی مجھ سے بڑھیا پیش کر رہا ہے۔۔۔۔"

کوئی گیارہ بجے تک محمد زماں نے گھوڑے کا انتظام کر دیا اور جب زمان اور مدن نے سہارا دے کر صفدر کو گھوڑے پر بٹھایا، اُس نے سارا جسم اس طرح ڈھیلا چھوڑ دیا جیسے گھوڑے پر آدمی نہیں، بنولوں کی بوری رکھی ہو۔ اُس وقت صفدر نے ٹوٹتی سی آواز میں کہا —— "بہت کمزوری ہے، میں شاید گھوڑے پر سے گر پڑوں گا۔ اچھا ہو، اگر ایک آدمی میری دائیں طرف چلتا رہے اور ایک بائیں طرف۔۔۔۔"

محمد زماں نے اپنے دو آدمیوں کو گھوڑے کی دونوں طرف کر دیا اور خود پیچھے پیچھے مدن اور باقی چار ساتھیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

اس طرح کوئی میل بھر راستہ گزر گیا تو وہ خار کی خان کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ اُس وقت مدن نے صفدر کی بتائی ہوئی تجویز کے مطابق ساتھیوں کو ایسے لطیفے سنانے شروع کئے کہ سبھی کی ہنستے ہنستے رفتار دھیمی پڑ گئی۔ ایک ایسا

سلسلہ جم گیا کہ وہ بھی باری باری اپنے لطیفے سنانے لگے۔

اس طرح دونوں ٹولیوں میں فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جب لطیفوں کا زور کچھ کم پڑ گیا تب مدن نے لاہور کالج کے من گھڑت دنوں کے دلکش قصے سنانے شروع کر دیئے۔ بیچ بیچ میں شعر و شاعری بھی ہونے لگی اور اس طرح دوپہر کے کوئی تین بجے تک دونوں ٹولیوں کا درمیانی فاصلہ کوئی تین فرلانگ ہو گیا۔

اب دُور سے خار کی خان کا قلعہ دکھائی دینے لگا تھا۔ یہ دُوری کوئی آدھا میل ہوگی، جب صفدر نے اچانک گھوڑے کو بڑے زور سے ایڑ لگائی اور اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔ گھوڑا دونوں اگلی ٹانگیں اٹھا کر ایک بار زور سے ہنہنایا، پھر سرپٹ بھاگنے لگا......

مدن اسی وقت کے انتظار میں تھا، زور زور سے چیخنے لگا۔

"دوڑو، دوڑو! میرے بھائی صاحب کو بچاؤ! یا اللہ، رحم کر، کرم کر!"

اللہ میاں نے مدن کو خوب لمبی ٹانگیں دے رکھی تھیں، ساتھ ہی پھیپھڑوں کا دم خم بھی۔ اس لئے وہ دوڑنے میں سب سے آگے ہو گیا۔

محمد زماں بھی تگڑا جوان تھا، مدن سے ذرا دو قدم ہی پیچھے تھا کہ مدن ایسی پھرتی سے زمین پر گر پڑا کہ محمد زماں بھی اس سے ٹکرا کر، ایک چکر سا کھا کر زمین پر گر پڑا۔ اور اس طرح اُس قلعے کے دروازے تک پہنچنے میں انہیں دیر ہو گئی۔ جس دروازے میں سے انہوں نے صفدر کو گھوڑے سمیت گزرتے ہوئے دور سے دیکھا تھا۔

مدن کو جھوٹ موٹ کا، اور محمد زماں کو سچ مچ کا لنگڑانا پڑ رہا تھا۔ وہ جب لنگڑاتے ہوئے قلعے کے دروازے تک پہنچے تو پہرے دار نے اُن دونوں کو اور اُن کے ساتھیوں کو گزرنے سے روک دیا۔ کہا کہ جب تک تحصیلدار صاحب خود آ کر شناخت نہیں کر لیں گے، کسی کو قلعے کے اندر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔

وہ سبھی دروازے پر انتظار کر رہے تھے، جب پہرے دار نے بتایا کہ ابھی ابھی ایک گھوڑا سوار سمیت آیا تھا، دروازے سے ٹکرا گیا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے گھوڑے پر قابو پایا اور زخمی سوار کو تحصیلدار صاحب کے گھر پہنچایا ہے۔

کوئی پندرہ منٹ بعد تحصیلدار نے آکر سب کو دعا سلام کیا اور اندر اُس بیٹھک میں لے گیا جہاں قالین پر لیٹا ہوا صفدر کراہ رہا تھا۔ صفدر کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن تحصیلدار نے سب کو حوصلہ دیا کہ باہری زخم کوئی نہیں مگر سر میں اندرونی چوٹ لگی ہے۔ چوٹ سے بھی زیادہ صدمہ پہنچا لگتا ہے اور تحصیلدار نے مدن کو خاص طور پر حوصلہ دیا ——— "جناب میاں محمد حسین، آپ رتی بھر فکر نہ کریں۔ آپ کے بزرگ بھائی صاحب، انشاء اللہ، چار چھ دن میں صحت یاب ہو جائیں گے۔"

محمد زماں نے جلدی سے مدن سے کہا ——— "مجھے پورا یقین ہے کہ دو چار گھنٹے آرام کرنے کے بعد آپ کے بھائی صاحب سفر جاری رکھ سکیں گے۔ اگر ہم جلدی سے جلدی شہزادہ صاحب کے پاس نہ پہنچے تو میرے خلاف لعنت ملامت بپا ہو گی کہ ہم نے مریض کو اُن کے ذاتی حکیم تک کیوں نہیں پہنچایا۔"

مدن نے محمد زماں کو سمجھایا ——— "جناب، آپ فکر نہ کریں، میں خود شہزادہ صاحب کی تسلی کروا دوں گا۔ لیکن اس وقت بھائی صاحب کا سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میں اس وقت انہیں سفر کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

اب محمد زماں کا لہجہ سخت ہو گیا اور اُس نے تقاضا کیا کہ اور چار گھنٹے بعد یہاں سے چلنا ہی ہو گا۔

یہ وقت تھا، جب تحصیلدار نے دخل دینا مناسب سمجھا اور محمد زماں سے کہا کہ وہ سارے آدمی واپس جاکر شہزادہ صاحب کو اطلاع کر دیں۔ وہ یقین رکھیں گے کہ ان کے دوست میرے دوست ہیں جیسے، ہی معزز مہمان صفدر صاحب سفر کے

قابل ہو جائیں گے۔ میں ذاتی ذمہ داری پر انہیں صحیح سلامت شہزادہ صاحب کے دولت خانے پہنچا دوں گا۔

محمد زماں بہت ناخوش تھا، اس لئے اُس نے مدن کو ایک طرف بُلا کر کہا یہ تحصیلدار بالکل بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ آپ دونوں کا یہاں رہنا خطرناک ثابت ہوگا۔ اس پر مدن نے اُسے یقین دلایا کہ اُس کی نیک صلاح کے مطابق دونوں بھائی تحصیلدار سے چوکنے رہیں گے اور ایک ہفتے کے اندر اندر یہاں سے چل دیں گے۔

تحصیلدار جب محمد زماں اور اُس کے ساتھیوں کو باہر قلعے کے دروازے تک چھوڑنے کے لئے گیا، تب مدن کو صفدر سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس وقت صفدر نے بتایا کہ اُس نے تحصیلدار سے ملتے ہی ساری بات بتا دی ہے کہ اصل میں وہ حکیم عبدالسلام کے دوست ہیں اور یہاں کامریڈ محمد حسین سے ملنا چاہتے ہیں جو انہیں افغانستان سے حاجی محمد امین کے پاس پہنچا دے گا۔ انہوں نے اصل میں حاجی صاحب کی مدد سے روس کی سرحد پار کرنی ہے۔

مدن کو صفدر کی دُور اندیشی پر شک نہیں تھا، پھر بھی گھبراہٹ ہوئی کہ یہ سب کچھ تحصیلدار کو بتا دینا، جانے مناسب بات ہوئی ہے کہ نہیں ——؟

تحصیلدار جب لوٹا، اُس نے ایک خدمت گار کو بُلا کر دونوں کے لئے کھانا لانے کا حکم دیا اور مدن کی گھبرائی سی صورت دیکھ کر، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ــــ "میاں محمد حسین، میں بھی تمہارا بھائی ہوں، پٹھان بھائی۔ آپ دونوں خار کی خان کے علاقے میں ہیں، جہاں کوئی آنکھ اٹھا کر آپ کی طرف دیکھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ محمد زماں کو الوداع کہتے ہوئے میں نے خبردار کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اگر آپ کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو اس حرکت کا نتیجہ اُن کو بھگتنا پڑے گا۔"

اور تحصیلدار نے تفصیل سے یہ بھی بتایا کہ پہلی ملاقات کے دوران ہی وہ

سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں شہزادے کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ کامریڈ محمد حسین سے بھی ملا تھا، اور دونوں پریشان ہوئے تھے کہ وہ شہزادے کے آدمیوں میں پھنس گئے ہیں۔ لیکن دُکھ یہ تھا کہ اب اُن کی مدد کس طرح کی جائے۔

یہ شام مدن اور صفدر کی پہلی شام تھی، جو بہت دنوں کی، تن کی اور من کی تھکاوٹ کے بعد انہیں پورے سکون کی مِل پائی تھی۔ اُس رات کا کھانا صرف لذیذ ہی نہیں تھا، ایک دوست کے ساتھ میں تھا، ایک دوست کی پناہ میں تھا۔

رات کو کھُلے صحن میں دونوں کے بستر لگائے گئے۔ اُس رات انہوں نے مخملی لحاف بھی انگ لگایا اور مخمل سے ملائم دوستی کا احساس بھی۔

وہ رات چودھویں کے چاند والی رات تھی۔ مدن نے کبھی چاند کو اس قدر خوبصورت نہیں پایا تھا۔ لیکن اس کے مقصد کا جادو، چاندنی کے جادو سے کم نہیں تھا۔ سوویت روس کا مکھ دیکھنا اُس کے لئے یار کا مکھ دیکھنے کے برابر تھا اور اسے مدت سے بھولا ہوا ایک ٹپّا یاد آنے لگا۔

"چن چڑھیا کل عالم ویکھے
میں وی ویکھاں مکھ یار دا"

۱۰

تحصیلدار نے ایک بڑا مناسب قدم اُٹھایا، مدن اور صفدر دونوں کو خارکی خان سے ملا کر، دونوں کو علاقے کی حفاظت دلوا دی۔ خارکی خان با اصول آدمی تھا اور اپنے معتبر صلاح کار پر یقین رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے مدن اور صفدر سے کوئی پوچھ تاچھ نہیں کی۔

اگلی رات تحصیلدار کے گھر مدن اور صفدر کی ملاقات ایک ایسے بزرگ آدمی سے ساتھ ہوئی جس سے تحصیلدار استاد صاحب، کہہ کر مخاطب ہوتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ پہلی جنگ عظیم کے وقت وہ برطانوی فوج میں تھا، جہاں ترکی میں وہ جرمن فوج کے ہاتھ پڑ گیا تھا، جنہوں نے اُسے فوجی ٹریننگ دے کر برطانوی فوج سے لڑنے کے لئے تیار کیا تھا۔ وہ جب جنگ کے بعد ہندوستان لوٹا تو برطانوی جاسوس اُس کے پیچھے پڑ گئے۔ اُس وقت وہ خار کی خان کی پناہ میں آگیا۔ اب وہ بیس سال سے یہاں ہے اور برٹش حکومت کا سخت مخالف ہے۔

استاد صاحب کی ملاقات نے مدن اور صفدر کا یقین مزید پختہ کر دیا کہ تحصیلدار کو ان دونوں کی بغاوتی دلچسپیوں سے کسی طرح کی شکایت نہیں ہے۔

اگلی دوپہر تحصیلدار دونوں کو ایک ضلع حاکم کے گاؤں میں لے گیا، جو اناج اور شہد کی صورت میں خار کی خان کو جزیہ چکاتا تھا۔ لیکن ضلع کا سارا انتظام اُس کے اپنے ہاتھوں میں تھا۔ خود مختار ہاتھوں میں۔ وہ خار کی خان کے اس اصول کا کڑا پابند تھا کہ اس کے علاقے میں چوری اور ڈاکہ، موت کی سزا سے کم جرم نہیں گنے جا سکتے۔ اس ضلع حاکم نے مدن اور صفدر کی بہت خاطرداری کی۔ کچھ دیر بعد دونوں نے یہ بھی جانا کہ وہ ضلع حاکم کامریڈ محمد حسین کی انڈر گراونڈ سیاسی پارٹی کا ممبر بھی ہے۔

یہاں اُن کو معلوم ہوا کہ کامریڈ محمد حسین خار کی خان کے علاقے سے باہر، لیکن نزدیک ہی، ایک قلعے میں رہتا ہے۔ وہ قلعہ دریا کے دوسرے کنارے پر تھا۔ ضلع حاکم خان کے گاؤں سے کوئی سات میل دُور۔ خان اور تحصیلدار نے چاہا کہ کامریڈ محمد حسین کے ساتھ مدن اور صفدر کی ملاقات کسی طرح بھی خار کی خان کی اطلاع میں نہیں آنی چاہیئے۔ اس لئے لگ بھگ آدھی رات کے وقت انہوں نے کامریڈ محمد حسین کو یہ خبر بھیجی کہ دونوں ملاقاتی رات اُسی گاؤں میں گزار کر، اگلے دن اُس سے ملاقات کے لئے

آئیں گے۔

مدن عام طور پر چپ رہتا تھا، لیکن اس رات سیاسی حالات پر باتیں ہوتی رہیں تو مدن نے بڑے خلوص سے اپنا نظریہ پیش کیا کہ دنیا دو حصوں میں بٹ جائے گی، ایک بڑی طاقت سوویت یونین ہو گی۔ عوام کی اور محنت کشوں کی حمایت میں اور ایک اینگلو امریکن بلاک ہوگا، امپیریلزم کے لیڈر سے نظام والا۔ مدن نے صاف الفاظ میں یہ بھی کہا کہ آزادی کی جدوجہد کر رہا ہندوستان اور دوسرے کولونیل ملک، سوویت یونین کی آئیڈیا لوجی کی حمایت کر کے بڑا اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

مدن کو اس رات حیرانی بھی ہوئی، تسکین بھی کہ ضلع حاکم اور تحصیلدار گہرا سیاسی علم رکھتے ہیں۔

رات گزارنے کے لئے ضلع حاکم کا مہمان خانہ بہت بڑا تھا، لیکن مناسب یہی سمجھا گیا کہ مدن اور صفدر دونوں گاؤں کی مسجد میں چلے جائیں اور ایک ہتھیار بند آدمی کا انتظام کر دیا گیا جو صبح کی نماز کے بعد دونوں کو کامریڈ محمد حسین کے پاس لے جائے گا۔

دریا اُن دنوں تقریباً سُوکھا پڑا تھا۔ صبح جب مدن اور صفدر اپنے ساتھی کے ساتھ دریا پار کر کے دوسری سرحد میں داخل ہوئے تو جلدی ہی وہ قلعہ دکھائی دینے لگا۔ جو باہر سے اونچی اونچی مٹی کی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔

قلعے کی حفاظت کے لئے ہتھیار بند پہرا تھا، لیکن گزشتہ رات پیغام پہنچ چکا تھا، اس لئے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ مدن نے دیکھا کہ قلعے کے اندر مسجد کے گرد کوئی تیس گھروں کی آبادی ہے، جس میں ایک چھوٹے سے کمرے میں کامریڈ محمد حسین رہتا ہے۔

محمد حسین ایک لمبا پتلا کوئی پچاس سال کا شخص تھا، جس کے خوبصورت چہرے کی گہری لکیریں اُس کے علم اور سنجیدگی کا آئینہ تھیں۔ پشتو اُس کی مادری زبان تھی، لیکن اردو اور انگریزی بھی اس کی مادری زبان جیسی ہو گئی تھی۔ نرم زبان میں اور بڑی

شائستگی سے بولنے والے اس شخص کو دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ہندوستان کے سب صوبوں میں پولیس کو اس باغی کی سخت تلاش تھی۔

ہندوستان کے کمیونسٹوں کی طرح، محمد حسین نے بھی یہ سیاسی راستہ، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں رہ کر اپنایا تھا۔ وہ پشاور میں پیدا ہوا تھا، سرکاری نوکری کرتا تھا اور نوکری چھوڑ کر گاندھی موومنٹ میں آگیا تھا۔ گاندھی کے عدم تشدد سے وہ اتفاق نہیں کر پایا تھا۔ اس لئے اُس کی ذاتی آئیڈیالوجی نے اُسے کمیونزم کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ پھر جب برطانی سرکار نے اُسے پکڑ کر پشاور جیل میں ڈال دیا، تو وہ کسی طرح جیل سے فرار ہو گیا تھا اور تب سے اس قبائلی علاقے میں جلاوطن ہو کر رہ رہا تھا۔

محمد حسین کے لب و لہجہ میں سیاسی سنجیدگی بھی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ کمال کا زندہ دل بھی تھا، حتیٰ کہ ایسے مذہبی ماحول میں بھی خدا پر طنز کر دیتا تھا۔ مدن کو ہنسی آ گئی جب شام کی چائے پیتے ہوئے محمد حسین نے کہا ——— "چلو بھائی صاحب نماز کا وقت ہو گیا ہے، مل کر خدا کے ساتھ ٹھگی کر آئیں۔"

اور محمد حسین خود بھی ہنسنے لگا ——— "لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی رضا کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ لہٰذا اس بات کی ہم بھی تائید کر آئیں اور پتے ہلا آئیں۔"

صفدر ہونٹوں میں مسکرا رہا تھا، جب مدن نے کہا ——— "اگر خدا کوئی ہے تو وہ ہم جیسے پاجیوں سے ضرور محبت کرتا ہوگا، جو یہ ٹھگی صرف اُس کے ساتھ کرتے ہیں، اس کے بندوں کے ساتھ نہیں کرتے۔"

نماز ادا کرنی تھی، اس لئے تینوں نے قلعے کی مسجد میں جا کر ادا کی اور پھر کمرے میں آ کر سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ آگے کیا کرنا چاہیئے۔ محمد حسین نے کہا کہ انتظام ہوگا، لیکن افغانستان میں داخل ہونے کے انتظام کے لئے کچھ ہفتے ضرور لگ جائیں گے۔ کیونکہ صرف حاجی محمد امین انہیں سویت یونین کی سرحد تک پہنچا سکتا ہے، اور

اُس تک کوئی بھی پیغام صرف بادشاہ گل کے ذریعے بھیجا جا سکتا ہے، جسے برطانوی سرکار اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتی ہے۔

مدن اور صفدر نے اس بات چیت سے یہی مناسب سمجھا کہ دونوں کو ضلع حاکم کے گاؤں میں رہنا چاہیئے۔ کیونکہ وہاں سے یہ قلعہ نزدیک پڑتا ہے۔

تحصیلدار نے بھی کچھ دن ضلع حاکم کے پاس ٹھہرنے کا بندوبست کر لیا تاکہ وقت بے وقت مدن اور صفدر اُس سے مل سکیں۔ ویسے بھی یہ رمضان کے دن تھے اور دوستوں کے ساتھ میں یہ دن اچھے گزارے جا سکتے تھے۔ سبھی کو روزے رکھنے تھے، لیکن صفدر نے کہا — "مجھ سے سارا دن بھوکا نہیں رہا جاتا۔" اس پر ضلع حاکم نے کہا کہ ان دونوں کو مسجد میں رہ کر روزے تو رکھنے ہی پڑیں گے، لیکن ان دونوں کے لئے وہ بڑھیا شکر پارے بنوا دے گا، جو وہ مسجد کے کسی کونے میں چھپا کر رکھ لیں اور دن میں جب بھوک لگے، وہ چپ چاپ کھا لیا کریں۔

صبح مدن اور صفدر ضلع حاکم کے ساتھ لمبی سیر کے لئے نکل جاتے۔ دو چار دن رہ کر تحصیلدار لوٹ گیا تھا، لیکن وہ بھی دوسرے تیسرے دن آ جاتا اور اس طرح انتظار کے دن مدن اور صفدر کے لئے بہت آسان ہو گئے۔

رمضان کا بارہواں دن تھا، جب کامریڈ محمد حسین کا پیغام ملا کہ اگلے دن وہ دونوں کو بادشاہ گل کے پاس لے جائے گا۔ اس راستے کے لئے ضلع حاکم نے دو ہتھیار بند پٹھان اُن کی حفاظت کے لئے تیار کر دیئے۔

اگلے دن مقررہ وقت پر جب مدن اور صفدر خار کی خان کی سرحد سے دو میل آگے پہنچ گئے، تو محمد حسین دو دوستوں سمیت اُن سے آن ملا۔ انہیں جو اگلا راستہ پکڑنا تھا۔ وہ تنگ راستہ پہاڑی درّے جیسا تھا، جہاں اکثر مسافر لوٹ لئے جاتے تھے۔ اور قتل کر دیئے جاتے تھے۔ اس راستے کے لئے محمد حسین نے مدن اور صفدر کو ایک

پستول دے دیا اور کہا کہ کسی بھی جھاڑی کی اُوٹ میں اگر انہیں کوئی شک وشبہ لگے تو وہ بلا وارننگ گولی چلا دیں۔

اس ایک گھنٹے کے راستے کے بعد وہ بادشاہ گل کے علاقے میں داخل ہو گئے اور سب نے پستول جیبوں میں ڈال لئے۔ مگر وہاں پہنچنے پر سب کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ بادشاہ گل کو اچانک کسی کام کے لئے کابل جانا پڑ گیا تھا۔ سب نے مسجد میں جا کر نماز پڑھی اور پھر محمد حسین کے اشارے پر مدن اور صفدر چپ چاپ مسجد سے باہر آ کر گاؤں کی گلیوں میں چلنے لگے۔ وہاں محمد حسین نے بتایا کہ بین الاقوامی حالات ایک نیا موڑ لے گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ سوویت یونین اور جرمنی کا آپسی سمجھوتہ ٹوٹ رہا ہے۔ لہٰذا قبائلی علاقے کے مستقبل کے لئے بادشاہ گل کا کابل جانا ضروری ہو گیا تھا۔ اب رات یہاں گزار کر صبح سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیئے۔

اگلی صبح محمد حسین نے بتایا کہ اُسے بادشاہ گل کے لوٹنے کی کوئی خبر نہیں مل پائی۔ اس لئے اُس نے تحصیلدار کے پاس آدمی بھیج دیا ہے کہ افغان سرحد کے نزدیک مدن اور صفدر کے رہنے کا انتظام کسی گاؤں میں کر دیا جائے اور ساتھ ہی اُس نے بتایا کہ جو آدمی حاجی محمد امین کے پاس گیا ہوا تھا، وہ ایک یا دو دنوں تک لوٹنے والا ہے۔

دوپہر تک تحصیلدار سے اطلاع مل گئی کہ خار کی خان کے علاقے کی جو سرحد افغانستان کے قریب ہے، وہاں کے ایک گاؤں میں دونوں کے رہنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ وہاں وہ دونوں استاد صاحب کے مہمان ہوں گے۔ اُن سے وہ تحصیلدار کے گھر مل چکے ہیں۔

دونوں شام تک اُستاد صاحب کے گاؤں میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ اونچے پہاڑوں کے پاؤں میں بسی ایک وادی تھی جہاں پہاڑی چشموں سے گرتے پانی کی آواز ایک عجب وقت میں

ساٹ سروں کی طرح سنائی دیتی تھی۔ یہ قدرت کا بڑا ہی سہانا منظر تھا۔ اُستاد صاحب نے بتایا کہ اس وادی کو سب سے پہلے بودھوں نے آباد کیا تھا۔ جو اس کی گپھاؤں میں آکر بسے تھے۔ انہوں نے ہی ایک گپھا سے دوسری گپھا تک پانی کے انتظام کے لئے نالیاں بچھائی تھیں اور مدن سارا سارا دن ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری گپھا میں جاتا، وقت کے نام و نشان کھوجتا رہتا......

اس گاؤں میں رہتے ہوئے مدن اور صفدر کو قریب ایک مہینہ ہو چلا تھا، جب دسمبر کے دوسرے ہفتے محمد حسین کی طرف سے اطلاع ملی کہ حاجی صاحب اس علاقے میں آنے والے ہیں اور ان سے دونوں کی ملاقات جلدی ہو جائے گی۔

مدن اور صفدر نے تحصیلدار کو یہ خبر بھیجی اور آج تک کی مدد کے لئے شکریہ بھی جس کے جواب میں تحصیلدار نے خود آکر انہیں الوداع کہی۔

مدن اور صفدر خاں کی خان کے علاقے میں سرحد پر جاکر محمد حسین سے ملے، جہاں سے وہ دونوں کو حاجی محمد آمین کے پاس لے گیا۔ وہ تینوں شام کو اس گاؤں میں پہنچ گئے تھے، لیکن راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں میں بیٹھے سورج ڈوبنے کا انتظار کرنے لگے، جب وہ لوگوں کی نظر بچا کر حاجی صاحب سے مل سکیں۔

حاجی صاحب جہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ مٹی کی اینٹوں والا ایک بڑا سا کمرہ تھا، جس کے ایک کونے میں جلتی ہوئی لکڑیوں نے دسمبر کی رات کو گرما دیا تھا۔ ان کے پہنچنے پر حاجی صاحب نے اُٹھ کر محمد حسین کو گلے سے لگا لیا اور بڑی گرمجوشی سے مدن اور صفدر کو خوش آمدید کہا۔ اُس وقت حاجی صاحب کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، جب وہ کچھ دیر بعد چلے گئے تو حاجی صاحب نے بتایا کہ وہ اسی گاؤں کے بزرگ ہیں جو دعوے کرتے ہیں کہ اُن کے پاس حضرت محمد صاحب کا مُوئے مبارک ہے، جسے بڑے ادب سے انہوں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اُسی کے دیدار کے لئے وہ کل

کی دعوت دینے آئے تھے۔ حاجی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اس گاؤں کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں، اس لئے حاجی صاحب کے دوستوں کو اس گاؤں میں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔

محمد حسین نے اُس وقت مدن کا حقیقی تعارف کروایا اور بتایا ——— "یہ مُلّا صاحب، اصل میں ہندو ہیں، مدن موہن ہردت جو صفدر صاحب کے ساتھ مل کر سوویت یونین پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ وہاں سے سیاسی ٹریننگ لے کر اپنے ملک ہندوستان کو آزاد کروا سکیں"۔

حاجی صاحب نے مدن کی پیٹھ زور سے تھپ تھپائی اور کہا ——— "شاباش، بہت خوب۔ خوب رنگ بدلا ہے۔۔۔۔۔"

اور پھر گمبھیر ہو کر حاجی صاحب کہنے لگے ——— "آپ لوگ جو بھی مدد چاہیں گے، میں کروں گا۔ میں ہندوستان کے سیاسی حالات سے اب واقف نہیں ہوں، اس لئے اس کے بارے میں میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔ مگر سوویت روس کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ آج کا روس لینن کے وقت کا روس نہیں رہا، اس لئے آپ لوگ جو تصور لے کر جا رہے ہیں آپ کو ناامیدی حاصل ہوگی۔۔۔۔۔۔"

حاجی صاحب نے مدد کا وعدہ کر لیا تھا، اس لئے سب اُن سے رخصت ہو کر سونے کے لئے چلے گئے۔ مگر مدن بہت پریشان تھا، اس لئے صفدر نے اُس سے کہا ——— "حاجی صاحب کے انقلابی خیالات پر مذہب کی افیم کا رنگ چڑھ گیا لگتا ہے۔ سوویت یونین کے موجودہ حالات سے حاجی صاحب ناواقف لگتے ہیں۔ ہمارے مقصد کی اہمیت صرف ہم لوگ جانتے ہیں، حاجی صاحب نہیں جان سکتے"۔

مدن صفدر کو ہر طرح سے اپنے سے زیادہ سمجھدار سمجھتا تھا، اس لئے اُس نے صفدر کی بات پر یقین کر لیا، لیکن حاجی صاحب کی ایمانداری پر شک نہیں ہوا۔

صبح صبح کامریڈ محمد حسین کو اُن سے رخصت لے کر لوٹ جانا تھا، اس لئے مدن کی

رات والی اداسی مزید گہری ہو اٹھی۔ دونوں اپنے دوست کو رخصت کرنے کے لئے گاؤں سے باہر اُس کے ساتھ آئے اور جب، جاتے ہوئے محمد حسین نے مدن کو گلے سے لگا کر کہا ـــــ "میرے ہم نام، مجھے یاد رکھنا۔ تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے"۔ تب مدن کی آنکھیں بھر آئیں۔ منہ سے صرف اتنا نکلا ـــــ "بھائی جان، میں ہمیشہ آپ کے نقش قدم پر چلوں گا......"

وہ دونوں وہاں سے لوٹ کر حاجی صاحب کے کمرے میں پہنچے، تو اُس وقت تک کمرے میں اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ حاجی صاحب کے مرید بڑے زور زور سے "اللہ ہو، اللہ ہو" کہہ رہے تھے۔ ایک وجد کا عالم سب پر طاری ہو گیا لگتا تھا اور پھر وہ سب اُٹھ کر گاؤں کے معزز ترین بزرگ کے گھر کی طرف چل دیئے، جہاں حضرت محمدؐ صاحب کے مُوئے مبارک کا دیدار حاصل کرنا تھا۔

مدن اور صفدر بھی حاجی صاحب کے ساتھ چل دیئے۔ اُس گھر میں ایک چھوٹی سی صندوقچی تھی، جسے حاجی صاحب نے پہلے ہونٹوں سے چوما پھر صندوقچی کو کھولا۔ مریدوں میں سے ایک ایک نے آگے بڑھ کر ریشمی رومال پر رکھے ہوئے موئے مبارک کا دیدار حاصل کیا اور اسی وقت حاجی صاحب نے قرآن شریف کی کچھ آیتیں پڑھیں۔

اس کے بعد اس گھر میں بھی حاجی صاحب کی دعوت تھی اور اسی دن باقی مریدوں کے گھروں میں بھی۔ اس لئے مدن اور صفدر کو ساتھ لے کر حاجی صاحب ہر مرید کے گھر میں گئے اور ہر گھر کی دعوت قبول کر کے جب واپس لوٹے تو شام ہونے کو آ گئی تھی۔

مدن اور صفدر کو مزید دو دن حاجی صاحب کے پاس رہنا تھا، اس لئے پہلے دن کی سرگرمی کے بعد، انہیں سیاسی باتیں کرنے کی اچھی فرصت مل گئی۔

مدن کو یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ حاجی صاحب کٹر مسلمان تھے۔

حاجی صاحب نے اپنی زندگی کے بارے میں بھی روشنی ڈالی کہ وہ فرنٹیئر کے رہنے والے تھے۔ اور ہندوستان کی آزادی کے لئے کئی بار برطانوی حکومت کی جیل بھی کاٹ چکے تھے۔ آخر میں وہ فرار ہو کر افغانستان آ گئے۔ افغان حکومت نے اُن کو پناہ دے دی اور اب وہ افغانستان کے شہر جلال آباد میں آ بسے تھے۔

اگلے دن حاجی صاحب نے مدن کو ایک طرف لے جا کر کہا ــــــ "آپ دونوں کے جانے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ میں تمہارے احساس کی شدت سمجھتا ہوں، اور وہ کشمکش بھی، جو تمہیں سوویت روس سے جا رہی ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ اصلی بغاوت وہ ہوتی ہے جو عوام کی خواہشات کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اصل میں انسان وہی ہوتا ہے جو عوام کی خوشی کا سچا مقصد سامنے رکھ کر اپنی تمام زندگی اُس مقصد کے لئے لگا دیتا ہے۔ بغاوت تب کامیاب ہوتی ہے۔ جب عام لوگ اُس کے لئے تیار ہو چکے ہوتے ہیں۔ بغاوت کبھی بھی باہر سے لا کر لوگوں پر لادی نہیں جا سکتی۔"

حاجی صاحب نے محمد علی نام کے ایک جوان کو مدن اور صفدر کے ساتھ کے لئے تیار کر دیا۔ انہیں رات ہونے پر گاؤں سے چل دینا تھا۔ لیکن اِس سے پہلے حاجی صاحب نے پھر ایک بار مدن کو اکیلے میں بلا کر کہا ــــــ "تمہاری جوانی پر مجھے رحم آتا ہے۔ تم نیک دل بندے ہو۔ میرے پاس بہت سے باغیچے ہیں۔ اگر تم یہاں بس جاؤ تو میں تمہیں کئی باغیچے دے سکتا ہوں۔ تم یہاں کسی خوبصورت لڑکی سے نکاح کر لینا۔ . . . . . ." اور حاجی صاحب نے ہنس کر یہ بھی کہا "مدن میاں، تم چاہو تو چار بیویاں تمہیں مل سکتی ہیں۔ . . . ."

اُس وقت مدن بہت ہنسا، کہنے لگا ــــــ "میں آپ کا بہت مشکور

ہوں، حاجی صاحب! لیکن مجھے ایک ہی پری زادی کا عشق لگا ہوا ہے۔ جب تک میں اپنے ملک کی آزادی کا منہ نہ دیکھ لوں، تب تک مجھے ایک بھی بیوی درکار نہیں ـــ"

۱۱

مدن اور صفدر نے ڈیورنڈ لائن کو نقشے پر دیکھا ہوا تھا لیکن پیروں تلے نہیں دیکھ سکے۔ وہ رات کے اندھیرے میں چلتے ہوئے، پتہ نہیں کس وقت اُن کے پیروں کے نیچے سے گزر گئی۔ صرف محمد علی کی آواز نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ اب افغانستان کی حد میں آگئے ہیں۔

جلال آباد کے شمال کی طرف، کابل دریا کے کنارے جب ایک گاؤں آیا تو محمد علی نے کہا کہ اس گاؤں میں حاجی صاحب کے کچھ مرید رہتے ہیں اس لئے یہاں کی مسجد میں بغیر کسی خطرے کے رات کاٹی جا سکتی ہے۔ رات وہاں رہ کر اگلی صبح کی نماز ادا کر کے اور گاؤں میں حاجی صاحب کے ایک مرید کے گھر میں کھانا کھا کر وہ تینوں جلال آباد کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچ کر مدن اور صفدر کو ایک مسجد میں چھوڑ کر محمد علی کابل کو جاتی ہوئی کسی بس کا پتہ لگانے چلا گیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ محمد علی کی بات ایک ٹرک ڈرائیور سے ہو گئی، اُسے آلوؤں کی بوریوں سے بھرے ٹرک کو اگلے دن صبح صبح کابل کی منڈی میں پہنچانا تھا۔ محمد علی نے مسجد میں آکر مدن اور صفدر کو بتایا کہ ٹرک ڈرائیور نے اُن تینوں

کو ٹرک میں بٹھانا مان لیا ہے۔ لہٰذا وہ تینوں فوراً ہی مسجد سے چلے گئے اور جلدی سے ہاتھ پیر اڑا کر ٹرک میں آلوؤں کی بوریوں پر بیٹھ گئے۔

ٹرک کے ہچکولوں سے کبھی تینوں مسافر بوریوں پر گر پڑتے کبھی بیٹھ جاتے اس طرح صبح کابل پہنچ کر جب وہ ٹرک سے نیچے اُترے تو ان کا جوڑ جوڑ ہلا ہوا تھا۔ بہرحال گرتے پڑتے جب وہ ساتھ کی مسجد میں پہنچے تو ان کو تسلی ہوئی کہ ان کے مولانا چوغے اور تسبیحیں سرکاری کاغذات سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

وہاں ایک دن سستا کر وہ بس میں مزار شریف چلے گئے جو وہاں سے ایک سو پچاس میل کے قریب دور تھا۔ وہ شہر اس آمو دریا کے کنارے پر تھا۔ جس کے اُس پار ازبکستان تھا اور وہ اُس دریا کو پار کر کے سوویت یونین میں داخل ہو سکتے تھے۔

رات ایک سرائے میں گزار کر، صبح صبح صفدر نے کہا کہ دریا پر جا کر پتہ لگانا چاہیئے کہ کب اور کہاں سے دریا پار کیا جا سکتا ہے۔ تینوں کا مل کر جانا مناسب نہیں تھا، اس لئے ۔ن مولانا چوغہ پہنے شہر میں گھومتا رہا اور صفدر اور محمد علی دریا کی طرف چلے گئے۔

مدن جب شہر میں گھومتا ہوا تھک کر شہر کی سب سے بڑی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تو اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح دیکھ کر ایک نوجوان افغان اُس کے پاس آ بیٹھا کہ اُس کے سر میں سخت درد ہے، اس لئے مولانا صاحب کوئی جھاڑ پھونک کر دیں۔

مدن نے اس نئی آفت سے گھبرا کر آنکھیں موند لیں اور ہونٹوں میں خدا کے آگے التجا کی کہ اسے اس آفت سے چھڑائے۔ داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور ایک

انگلی سے اُس افغان کی کنپٹیوں کو دباتا رہا اور پھر اُٹھ کر مسجد کے اندر چلا گیا۔ لیکن چند لمحہ بعد وہ افغان بھی سیڑھیوں سے اُٹھ کر اُس کے پیچھے پیچھے آ گیا اور آتے ہی اُس کے پاؤں پکڑ کر کہنے لگا ــــــ "تم خدا کو پہنچے ہوئے آدمی ہو، میرا درد رفع ہو گیا..."

اور افغان نے جیب میں سے کچھ سکّے نکال کر اُس کے پیروں میں رکھ دیئے اور اُس وقت مدن کی آواز کو حوصلہ ہوا اور اُس نے ہنس کر کہا ــــــ "درد تو اللہ تعالےٰ نے رفع کیا ہے، یہ سکّے اُس کے کسی ضرورت مند بندے کو دے دو میں نہیں لوں گا۔"

اس طرح مدن عجیب خیالات میں ڈوبا ہوا سا واپس سرائے میں آیا تو صفدر اور محمد علی اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر مدن کی ساری اُمید ٹھنڈی پڑ گئی۔ کیونکہ صفدر کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ صفدر نے بتایا کہ دریا بہت گہرا ہے، کسی طرح بھی پار نہیں کیا جا سکتا۔ کشتی کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہر جگہ برطانوی جاسوس لگے ہیں۔

اُس وقت محمد علی نے کہا کہ اب جلال آباد لوٹنے کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وہاں جلال آباد میں حاجی صاحب کے دوست بھی ہیں اور مرید بھی۔ شاید وہ کوئی راستہ نکال سکیں۔ صفدر نے رضامندی ظاہر کی۔ لیکن کچھ سوچ کر کہنے لگا ــــــ "اس سے بہتر ہے کہ ہم کابل میں رہ کر کوئی راستہ نکالیں۔"

یہ جنوری کا مہینہ تھا۔ سارا کابل برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ مدن اور صفدر نے ایک کباڑیئے سے موٹے موٹے لمبے کوٹ خریدے لیکن جاڑا اُن کی ہڈیوں میں اُتر گیا تھا۔ صفدر کو سردی سے نمونیہ ہو گیا اور مدن کے دونوں پاؤں سُوج گئے۔ غنیمت تھی کہ محمد علی کابل میں رہنے والے ایک ہندوستانی ڈاکٹر نور محمد کو جانتا تھا۔ جو کابل کے فوجی ہسپتال کا ڈاکٹر تھا۔

ڈاکٹر نور محمد کی سفارش پر صفدر کو ہسپتال میں داخل کر لیا گیا لیکن مدن کبھی سرائے

میں رات گزارتا اور کبھی مسجد میں۔ ویسے ڈاکٹر نور محمد کے کہنے پر وہ گرم پانی نمک ڈال کر پیروں کو سینکتا رہا اور اُس کے پیروں کی سوجن اُترنے لگی۔

صفدر کو ہسپتال سے خارج ہوتے ہوتے کوئی دو ہفتہ لگ گئے، لیکن وہ ابھی بھی کمزور تھا۔ سفر کے قابل نہیں تھا۔ اُدھر محمد علی کو اتنی دیر تک ایک ہی جگہ پر رہنا شاید خطرے سے خالی نہیں لگا تھا۔ اس لئے وہ بنا کچھ کہے اور بتلائے دونوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر لاپتہ ہوگیا۔

اب کابل میں صرف ڈاکٹر نور محمد تھا جسے وہ دونوں جانتے تھے اور کوئی بھی ذریعہ اُن کے پاس نہیں رہ گیا تھا۔ اس لئے مدن اور صفدر نے نور محمد کے سامنے اپنا مقصد بھی رکھ دیا اور اپنی مشکل بھی۔ نور محمد نے اُن سے پوچھ تاچھ کر کے کہا کہ وہ بس میں حیرات چلے جائیں، وہ شہر کابل سے مغرب کی طرف ہے اور وہاں سے سوویت یونین کی سرحد صرف پچاس میل ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نور محمد نے راستے کے لئے کچھ روپے دینے چاہے، لیکن نور محمد کی دوستانہ مدد ہی اُن کے لئے بہت قیمتی تھی۔ پیسوں کے بغیر ابھی کام چل سکتا تھا۔

حیرات سے اگلا پچاس میل کا راستہ جانے ویران تھا کہ آباد۔ اس لئے مدن اور صفدر نے اُس راستے کے لئے دو درجن اُبلے ہوئے انڈے اور آٹھ نان خرید کر رکھ لئے۔ ڈاکٹر نور محمد نے بتایا تھا، حیرات سے کچھ دوری پر سڑک بٹ جاتی ہے۔ جس کی دائیں طرف والا راستہ سوویت یونین کی طرف جاتا ہے اور دوسرا ایران کی طرف۔ دونوں نے اندازہ لگایا کہ اس سفر میں انہیں پانچ دن سے زیادہ وقت نہیں لگ سکتا۔

حیرات سے اگلے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے دونوں کے پیروں میں دم بھی تھا اور مدہوشی بھی کیونکہ اُن کی منزل کا یہ آخری پڑاؤ تھا۔ پہلی رات کے آرام کے لئے راستے کے ایک طرف بنی ایک مسجد سی مل گئی جہاں سے صبح اُٹھ کر انھوں نے اگلی راہ پکڑی۔ دوپہر

ڈھلتے تک وہ خانہ بدوشوں کے ایک ڈیرے میں پہنچ گئے۔ جنہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ ان کی خاطر داری کی۔ رات کا کھانا بھی کھلایا اور سونے کے لئے اپنا ایک تمبو دے دیا۔

رات کسی طرح گزر گئی کیونکہ ڈیرے والوں کے کمبلوں میں پسو پڑے ہوئے تھے۔ جو رات بھر انہیں کاٹتے رہے۔ مگر وہ بدن کھجلاتے ہوئے اگلے راستے پر چل پڑے۔

اگلا راستہ بہت ویران تھا، ریگستان۔ صرف دوپہر کے وقت اُن کو ایک خیمہ سا دکھائی دیا جس کے نزدیک بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں۔ وہ خیمے کے پاس پہنچے تو ادھیڑ عمر کی ایک عورت خیمے سے باہر آئی، جس نے انہیں دودھ کا پیالہ بھی دیا اور خیمے میں بیٹھ کر آرام کرنے کے لئے بھی کہا۔

وہ خیمے میں کچھ دیر ہی بیٹھے تھے کہ مارن کا ہم عمر لیکن چھوٹے قد کا ایک لڑکا آیا، جس سے تعارف کرواتے ہوئے اُس عورت نے بتایا کہ اُس کا بیٹا محمد ہے۔

محمد کا لہجہ دوستانہ تھا، اس لئے صفدر نے اُس سے پوچھا —— "تم جانتے ہو کہ افغان سرحد کی فوجی چوکی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"بہت نزدیک۔" محمد نے کہا، "مشکل سے دو دن لگیں گے وہاں پہنچنے میں!"

"تم کبھی وہاں گئے ہو؟" صفدر نے پوچھا، تو وہ جلدی سے بولا —— "کئی بار۔"

صفدر کہنے لگا —— "میں اور میرا چھوٹا بھائی، ہم دونوں حیرات سرکار کے ذاتی مولانا ہیں۔ حاکم صاحب سرحدی چوکی کا معائنہ کرنے آئے ہوئے ہیں لیکن بدنصیبی سے وہ سواری ہم سے چھوٹ گئی، جس میں ہمیں آنا تھا۔ ہمیں ڈر ہے کہ ہم راستہ ہی نہ بھول جائیں۔ ہم تمہارے بہت مشکور ہوں گے اگر تم ہمارے ساتھ چل کر راہ دکھا دو۔ اس مدد کے لئے ہم تمہیں تمہارا حق دیں گے۔"

محمد تیار ہو گیا مگر جب ماں کے ساتھ صلاح کرنے لگا تو مدن اور صفدر خیمے میں سے باہر آ گئے۔ مدن نے کہا ــــ "یہ جھوٹ کیوں بول دیا؟" صفدر کہنے لگا کہ ہمیں راستہ دکھانے کے لئے کوئی چاہیئے تھا اور چوکی کے نزدیک پہنچ کر کوئی اور بات بنانی ہو گی کہ محمد حیرات سرکار والی بات بھول کر، ہمیں سرحد پار کرنے کا طریقہ بتائے کیونکہ وہ اس علاقے کا واقف ہے لیکن ابھی اُس کی ماں کے سامنے کچھ اور نہیں بتانا چاہیئے تھا۔

محمد اُن کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ کوئی دوپہر دو بجے کا وقت تھا۔ اور رات ہونے تک کافی سفر طے ہو سکتا تھا۔ اگلا راستہ چڑھائی کا تھا۔ اُس ٹیلے کی دو گھنٹے کی لگاتار چڑھائی کے بعد مدن اور صفدر اتنے تھک گئے کہ انہوں نے محمد سے سستانے کے لئے کہا۔ مگر محمد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ رات کو آسمان سے بہت برفباری ہو گی، اس لئے کسی ایسی جگہ پر پہنچنا ضروری ہے۔ جہاں رات گزارنے کے لئے کوئی آسرا ہو۔

برفباری کے خوف نے دونوں کو نیا حوصلہ دے دیا اور وہ ٹیلے کے دوسری طرف سورج ڈوبنے تک پہنچ گئے۔ وہاں تینوں نے نماز ادا کی اور بیس منٹ کے سفر کے بعد ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ ان کی لمبی داڑھیوں اور ہاتھ کی تسبیحوں نے گاؤں کی مسجد میں اُن کے لئے عزت افزائی کا بندوبست کر دیا۔ وہاں ان کو گرم نان اور شوربا پیش کیا گیا۔ اُس راستے سے کبھی کبھار ہی کوئی مسافر گزرتا تھا۔ اس لئے گاؤں والوں کے لئے دو ملاؤں کا اُن کے گاؤں میں آنا بہت خوشی کی بات تھی۔

کچھ مشکل بھی پیش آئی، جب گاؤں والے حضرت محمدؐ صاحب کی تعلیم کے بارے میں کچھ سننے کے لئے مسجد میں آ بیٹھے۔ صفدر کو قرآن شریف کا علم زیادہ نہیں تھا۔

لیکن اُس کے پاس باتوں کا ایسا آرٹ تھا کہ گاؤں والے بڑی تسلی سے اس کی نصیحتیں سُنتے رہے۔

صبح اُٹھ کر جب دونوں نے پیچھے دُور چھوٹ گئے ٹیلے کی طرف دیکھا تو وہ پچ پچ برف سے لدا ہوا تھا۔ اُس وقت دونوں کو احساس ہوا کہ محمد نے رات کی برفباری سے ان کو بچا کر اُن کی جان سلامت رکھی ہے۔

اگلے سفر کی نماز کے بعد راستے میں چلتے چلتے صفدر نے محمد سے کہا——

"تم دوست نواز آدمی ہو اور قابلِ اعتبار بھی۔ اس لئے آج تمہیں سچی بات بتاتا ہوں کہ ہم دونوں بھائی روس میں جانا چاہتے ہیں ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے وقت ہمارے باپ دادا وہاں سے جان بچا کر آئے تھے اور اپنا سارا سونا اور قیمتی چیزیں وہاں گاڑ آئے تھے۔ اب ہم دونوں وہی سونا لینے جا رہے ہیں اگر تم ہمیں سرحد پار کرنے کا راستہ بتا دو، ہم آتے وقت تم کو بہت سا سونا دے جائیں گے۔"

محمد کی آنکھیں سونے کے خیال سے چمکنے لگیں اور اُس نے رُک کر کہا کہ وہ اُن کی مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔

دن کے تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ ایک ایسے گاؤں میں پہنچ گئے، جہاں محمد کا ایک دوست رہتا تھا۔ وہ دونوں کو اپنے دوست کے گھر لے گیا جہاں ان کو گرم روٹی بھی ملی اور رات کا ٹھکانہ بھی۔

محمد کا وہ دوست چور بازاری کا دھندا کرتا تھا، جس نے بتایا کہ وہ کئی بار سرحد پار کر چکا ہے، روس میں جاتا ہے جہاں طرح طرح کی چیزیں بیچ کر بہت سا منافع کما لیتا ہے۔

مدن کے ہاتھ میں پکڑا ہوا روٹی کا نوالہ اُس کے لئے زہر ہو گیا۔ اُسے لگا کہ محمد کا دوست سراسر جھوٹ بول رہا ہے اور اپنی مکاری سے سوویت یونین کے سر پر

اس طرح کا الزام لگا رہا ہے۔

رات کو مدن اور صفدر ایک کمرے میں تھے اور محمد اور اُس کا دوست دوسرے کمرے میں۔ صفدر کو نیند آگئی مگر مدن کے دل میں ہلچل تھی۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کا سناٹا اس قدر تھا کہ پتلی سی دیوار کے اُس پار سے محمد کی اور اس کے دوست کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑنے لگیں۔ دونوں فارسی زبان میں بول رہے تھے جو مدن نے اسکول میں پڑھی تھی۔ اور افغانستان میں رہتے ہوئے اس کے لئے بخوبی آسان ہوگئی تھی۔ مدن نے اچھی طرح کان لگا کر سُنا کہ محمد کا دوست ان دونوں کو مار کر اُن کا پیسہ لوٹنے کی بات محمد کو سُنا رہا ہے اور محمد بار بار اُن کو ملاّ کہہ کر اُن کے قتل کو گناہ کہہ رہا ہے۔

مدن نے جلدی سے لیکن دھیرے سے صفدر کو جگایا اور اُس کے کان میں ساری بات بتائی۔ دونوں کی جان خطرے میں تھی اس لئے دونوں نے اپنے ہاتھوں، جتنی بھی رقم ان کے پاس بچی ہوئی تھی، وہ دے کر اپنی جان بچانے کی تجویز سوچی۔

مدن حاجت کے بہانے کمرے میں سے باہر نکل گیا اور کچھ منٹوں کے بعد واپس لوٹتے ہوئے میزبان کے کمرے کے آگے جا کھڑا ہوا کہنے لگا ــــــ "آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟"

اُس وقت محمد نے حلیمی سے کہا ــــــ "آج کل میرے دوست کو پیسے کی بڑی قلت ہے۔ وہ بڑی فکر میں ہے، اس لئے اس کے ساتھ وہی باتیں کر رہا تھا۔"

مدن نے جلدی سے کہا ــــــ "یہ مہربان آدمی ہے۔ اس وقت ہمارے پاس جتنی بھی رقم ہے، ہم اسے دینے کے لئے تیار ہیں۔" اور مدن نے صفدر کو آواز دے کر بُلایا، کہا ــــــ "بھائی جان، ہمارا میزبان کچھ مشکل میں ہے۔ آپ کچھ پیسوں کی مدد ضرور کریں۔"

اس پر صفدر نے ہاں میں ہاں ملائی ـــــ" ہمیں تو کل وہاں پہنچ جانا ہے، جہاں ہماری بہت سی دولت پڑی ہے، لہذا جتنی بھی رقم ہمارے پاس ہے ہم دے سکتے ہیں بلکہ لوٹتے" ہوئے مزید بھی دے جائیں گے۔"

اُن دونوں کے پاس کوئی چار سو روپے بچے ہوئے تھے، جو انہوں نے بٹوے کو الٹا کر میزبان کے سامنے رکھ دیئے۔ اس پر میزبان نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ راستے میں ان کو کچھ ضرورت ہوگی، اس لئے کچھ روپے وہ اپنے ساتھ رکھ لیں۔ پھر ہو سکے تو لوٹتے وقت اس کی کچھ مدد کر جائیں۔

مدن نے مسکرا کر اُن روپوں میں سے دس کا ایک نوٹ اُٹھا لیا اور اُسے یقین دلایا کہ وہ لوٹتے ہوئے بھی رات کو اسی کے گھر میں ٹھہریں گے۔

صبح ہوتے ہی، رات کو جان بچ جانے کی خیر منا کر، وہ دونوں محمد کو ساتھ لے کر چل دیئے اور دن ڈھلنے تک پروانہ نام کے گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے جو بالکل افغان سوویت سرحد پر تھا۔

یہاں سے محمد کو پیچھے لوٹ جانا تھا لیکن رات کو اُس کے سامنے مدن اور صفدر نے اپنا بٹوا الٹا کر سارے پیسے اس کے دوست کو دے دیئے تھے، اس لئے محمد جانتا تھا کہ اب اُن کے پاس کوئی رقم نہیں تھی۔ اُس نے اصرار کیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ روس میں جائے گا۔ مدن اور صفدر کو اس پر اعتراض نہیں تھا، اس لئے محمد بھی اُن کے ساتھ تھا۔

تاروں سے بھری رات اُتر آئی تھی، جس وقت مدن اور صفدر نے اُس ندی میں پاؤں رکھے، جس کے اُس پار ان کے سپنوں کا ملک تھا۔

ٹھنڈے پانی کی کپکپی اُن کی رگوں میں اُتر رہی، لیکن مدن کو لگا کہ اس پانی کی آواز سریلے سروں میں اُن کو خوش آمدید کہہ رہی ہے . . . . . .

۱۲

۳، فروری ۱۹۴۱ء کا دن تھا.......

مدن نے ندی کے پانی میں سُن ہو چکے، کانپتے ہوئے پاؤں جب دوسرے کنارے پہ رکھے، پاؤں کے نیچے پہلے کنارے جیسی ہی ریت اور مٹی تھی، مگر مدن کو لگا کہ گویا اُس نے ستاروں پہ پاؤں رکھے ہوں......

صفدر نے دیکھا کہ پرے کچھ دُور سوکھے گھاس پھوس کا ایک ڈھیر سا پڑا ہے۔ اُس نے جیب میں سے ماچس کی ڈبیہ نکال کر اُسے جلایا اور سُن ہو چکے ہاتھ پاؤں سیکنے لگا......

مدن نے بھی اس دھونی پہ ہاتھ سینکے، لیکن اُس پر وجد طاری ہو گیا تھا۔ اُس نے دونوں باہیں پھیلا کر اونچی آواز میں ہیک لگائی —— "حاجی لوک مکّے نوں جاندے، اساں جانا تخت ہزارے......"

صفدر نے اُٹھ کر مدن کو گلے سے لگا لیا اور دھیرے سے کہا —— "یار، تخت ہزارے میں تو پہنچ ہی گئے ہیں، لیکن ابھی اتنی اونچی آواز میں نہ گاؤ، افغان سرحد سے ذرا دُور تو چلے جائیں........"

مدن ہنس کر اُس کے ساتھ آگے چل دیا لیکن اپنا اور صفدر کا ملاؤں والا لباس اب اسے سنجیدہ صورت بنا کر چلنے کی بجائے ہنسا رہا تھا۔ دھیمی آواز میں وہ صفدر سے کہنے لگا —— "دیکھو، رانجھا جوگی بن آیا......"

چار دن پہلے جو ناممکن سا تھا، اس وقت ممکن ہو گیا تھا۔ اس لئے مدن کی آنکھوں میں خوشی کا پانی بھر آیا۔ اور وہ جھوم کر کہنے لگا ——

اس جوگی دی کی وسے نشانی
ہتھ وچ تسبیح اکھ وچ پانی

کچھ دوری کے بعد اونچے اونچے ٹیلوں جیسی چڑھائی آگئی اور پھر انہیں ٹیلوں کی اترائی۔ گھنٹہ بھر ہموار زمین پر چلنے کے بعد جب پرے ایک چھوٹی سی سفید عمارت دکھائی دی تو محمد نے کہا کہ وہ روس کی فوجی چوکی ہے۔

وہ چوکی کے پاس سے گزرے تو ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی مگر کوئی آدمی چوکی سے باہر نہیں آیا۔ اس لئے وہ تینوں اپنی چال چلتے ہوتے چوکی سے آگے گزر گئے۔

ابھی پو پھٹی ہوئی نہیں تھی۔ وہ کوئی میل بھر چلے ہوں گے کہ اندھیرے میں سے ایک غیبی آواز آئی، کڑکتی ہوئی سی۔ سامنے کوئی دکھائی نہیں دیا لیکن وہ چونک کر کھڑے ہوگئے۔ صفدر کو روسی زبان آتی تھی، اُس نے مدن کو بتایا کہ یہ جو آواز آئی ہے، اس کا مطلب ہے کہ رُک جاؤ ورنہ گولی چلا دیں گے۔

"کیا مطلب؟" مدن نے حیران ہو کر پوچھا۔ اور صفدر سے کہا — "یار تمہیں روسی آتی ہے۔ تم اونچی آواز میں بول کر بتاؤ کہ ہم آتے ہیں —"

صفدر — آواز کا جواب دیا، جس کے جواب میں پھر سے کڑکتی ہوئی آواز آئی اور صفدر نے اُس کا مطلب بتایا — "وہ کہتا ہے، خبردار۔ ایک بھی قدم نہیں اُٹھانا، چپ چاپ ہتھیار پھینک دو۔"

مدن نے حیران ہو کر اپنی جیب میں ڈالی ہوئی تسبیح کی طرف دیکھا اور صفدر کے چوغے میں رکھی ہوئی تسبیح کا خیال بھی اُسے آیا۔ صفدر سے کہا — "یہ تسبیحیں تو اسلامی علاقوں میں ہمارے ہتھیار تھیں۔ لیکن یہاں یہ کیسے ہتھیار بن گئیں؟"

اتنے میں اندھیرے سے دو رائفلوں والے آدمی نمودار ہوتے، جنہوں نے

نہ تو پولیس کی وردی پہن رکھی تھی، نہ ہی فوجی وردی۔ لیکن اُن میں سے ایک نے سامنے کھڑے ہو کر رائفل تان لی، اور دوسرے نے اُن کے پیچھے کھڑے ہو کر۔ جب اُن کو تنی ہوئی رائفلوں کے بیچ میں آگے چلنے کے لئے کہا گیا تو صفدر نے مدن سے کہا ——— "یہ نزدیک کے کسی پنچایتی فارم کے آدمی لگتے ہیں، بے چاروں کو ہمارے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

جلدی ہی ایک عمارت سامنے دکھائی دی اور وہ رائفلوں والے ان کو عمارت کے اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔ مدن نے دیکھا کہ ایک سفید دیوار پر بہت بڑی سی اسٹالن کی تصویر لگی ہوئی ہے اور دوسری دیواروں پر چھوٹی چھوٹی لینن مارکس، وارو شیلوف، مالوٹوف اور چند دیگر لیڈروں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں ایک پرانی قسم کے گراموفون پر ریکارڈ بج رہا ہے.....

سامنے کی کرسی پر ایک بہت موٹا سا آدمی بیٹھا ہوا ہے، جس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا۔ میز پر اُس کی کوہنی کے پاس ہی دو بوتلیں پڑی ہوئی تھیں جن میں سے ایک خالی تھی اور ایک آدھی بھری ہوئی۔ وہاں میز کی ایک طرف ایک پلیٹ پڑی تھی، جس میں دو چار بند گوبھی کے پتے اور ایک ٹکڑا کھیرا، اور کھائی ہوئی مچھلی کے کچھ کانٹے بکھرے پڑے تھے.......

ایک رائفل والے نے آگے بڑھ کر اس کرسی والے سے کچھ کہا اور اُس نے گراموفون بند کر کے جب مدن اور صفدر اور محمد پر نظر ڈالی تو اُس کی نظر ٹک نہیں پا رہی تھی۔ جس سے مدن نے محسوس کیا کہ وہ کرسی والا بہت نشے میں ہے۔

اُس وقت صفدر نے اُس آفیسر کو کچھ بتانے کی کوشش کی لیکن اُس نے میز پر مُکا مار کر صفدر کو چپ رہنے کے لئے کہا۔ صفدر پھر بھی بتا تا رہا مگر ظاہر تھا کہ وہ آفیسر اُس کی کوئی بات نہیں سُن رہا تھا۔

محمد نے آگے بڑھ کر صفدر سے کہا ——— "یہ کس طرح کے لوگ ہیں، ہم ان کے گھر میں مہمان آئے ہیں، یہ ہمیں نہ چائے پانی کو پوچھتے ہیں، نہ بیٹھنے کو کہتے ہیں........"

صفدر نے محمد کی بات روسی زبان میں آفیسر کو بتائی، اور وہ جو کچھ بولا، صفدر نے ترجمہ کر کے محمد کو بتایا ——— "وہ کہہ رہا ہے کہ ہم برطانوی جاسوسوں کو چائے نہیں پلاتے۔"

اتنے میں وردی والے اور بندوقوں والے دو آدمی کمرے میں آ گئے۔ مدن نے باہر سڑک پر کسی گاڑی کے کھڑے ہونے کی آواز سنی اور اس آفیسر کے کہنے پر وردی والے آدمی تینوں کو باہر لے گئے۔ باہر ایک ٹرک کھڑا تھا جس میں تینوں کو بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ ٹرک میں کوئی سیٹ نہیں تھی، اس لئے تینوں ٹرک میں نیچے بیٹھ گئے۔

"یہ ہمیں کہاں لئے جا رہے ہیں ؟" مدن نے پوچھا مگر اس کا جواب مدن کی طرح صفدر کو بھی نہیں معلوم تھا۔

چلتے ہوئے ٹرک میں بیٹھا ہوا مدن سوچ میں پڑ گیا کہ یہ پنچایتی فارم والے بھلا، ہمیں جاسوس کیوں سمجھ بیٹھے ہیں! ٹھیک ہے کہ ہمارے پاس راہداری کے کاغذات نہیں ہیں، لیکن صفدر نے بتا جو دیا ہے کہ کن حالات میں ہم انگریز سرکار سے بچتے بچاتے آئے ہیں۔ پھر وہ ہمارے ساتھ اس طرح بدسلوکی سے کیوں پیش آ رہے ہیں۔

ایک گھنٹے کی دوری کے بعد وہ شہر کے فوجی محکمے میں پہنچے۔ اس شہر کا نام کوشکا تھا۔ اب ایک نیچی چھت والی لمبی سی عمارت تھی، جیسے گھوڑوں کا اصطبل ہو۔ اس کے دروازے میں سے گزرتے ہوئے مدن کو سچ مچ اصطبل جیسی تیکھی بدبو

آئی۔ مدن اور صفدر آگے آگئے تھے، محمد ان سے پیچھے تھا لیکن مدن اور صفدر جب اندر داخل ہوئے تو محمد کو باہر ہی روک لیا گیا اور مدن نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پچھلا دروازہ بند ہو چکا تھا۔۔۔۔۔۔

پیروں کے نیچے سیمنٹ کا فرش تھا لیکن گیلا اور بہت ٹھنڈا۔ مدن نے گھبرا کر صفدر کی طرف دیکھا تو صفدر کہنے لگا——"یہ کوئی بے وقوف لگتے ہیں لیکن احمق تو دُنیا میں ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ آتے ہی احمقوں کے ساتھ پالا پڑ گیا۔ کل جب ان کو اپنی غلطی کا پتہ لگے گا تو ہم بھی پیٹ بھر کر آج کے دن پر ہنسیں گے۔۔۔۔۔۔"

مدن اور صفدر اتنے لمبے راستے سے، اور ساری رات جاگنے سے اتنے تھکے ہوئے تھے کہ جو اوور کوٹ انہوں نے پہنے ہوئے تھے، انہیں میں گچھا مچھا ہو کر ننگے فرش پر سو گئے۔

وہ گھنٹہ بھر سوئے ہوں گے کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ایک باوردی آفیسر ہاتھ میں پستول لئے اندر آیا، جس نے کڑی آواز میں کچھ کہا۔ جواب میں صفدر کچھ کہتا رہا لیکن وہ اسی طرح کڑی آواز میں کچھ کہہ کر چلا گیا۔ دروازے کی آواز اس طرح آئی کہ اُسے چابی سے تالا لگا دیا گیا ہو۔

صفدر نے بتایا——"میں نے اُس سے کہا تھا کہ ہمیں غلطی سے آپ نے پکڑ لیا ہے، یہ میرا ساتھی ہندوستان کا انقلاب پسند ہے۔ جو بہت امیدیں لے کر سوویت یونین میں آیا ہے اور اس طرح کے سلوک سے اس کا سارا سپنا ٹوٹ جائے گا۔"

اور صفدر نے گہرا سانس لے کر کہا——"لیکن یہ فوجی لوگ دنیا میں ہر جگہ ایک سے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اپنے دماغ سے کچھ سوچتے ہی نہیں۔۔۔۔ صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ انہوں نے محمد کو بھی ایک اور کوٹھڑی میں ڈال دیا ہے۔"

کوئی ایک گھنٹہ بعد دروازہ پھر کھلا۔ اس بار دو ہتھیار بند فوجی سپاہی آئے جن کے ساتھ محمد بھی تھا اور وہ تینوں کو باہر کے لمبے برآمدے میں سے گزار کر، اُس کے ساتھ والی ایک منزلہ عمارت میں لے گئے جہاں اور بھی ہتھیار بند سپاہی تھے۔ اور انہوں نے تینوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے سارے کپڑے اتارنے کے لئے کہا.........

غصّے اور شرم سے کپڑوں کے بٹن کھولتے ہوتے مدن کے ہاتھ کانپنے لگے... جس کا جو بھی کپڑا اترتا، سنتری اُس کے ہاتھ سے چھین لیتا اور اُسے اُلٹا کر کے اُس کی سلائیوں تک کو ٹٹول کر پرے رکھ دیتا۔

اُس دن مدن کو پتہ نہیں چلا، لیکن اس نے اپنی تسبیح کو، چھوٹے سے چاقو کو اور دس کے نوٹ کو آخری بار دیکھا تھا........

اُتارے ہوتے کپڑے پہننے سے پہلے ان کا انگ انگ بھی ٹٹولا گیا۔ منہ کھلوا کر انگلیوں سے زبان کے نیچے اوپر، دائیں بائیں بھی، کانوں کے سوراخ تک بھی اور گھٹنوں کے بل اوندھے کروا کر ٹانگوں سے پچھلے حصّے تک بھی.......

اس کے بعد مدن اور صفدر کو ایک نئی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ یہ کوٹھری اُس اصطبل کے مقابلہ میں محالی شان، لگتی تھی کیونکہ اس میں دو چارپائیاں بھی تھیں۔ چارپائیوں پر موٹی چٹائیاں بھی، اور کوٹھری کے ایک کونے میں لوہے کی انگیٹھی اور لوہے کی چائے دانی بھی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر دو مگ تھے، ڈبل روٹی کے ٹکڑے، مچھلی کا ڈبّہ اور دو سیب۔

یہ سپنے والے ملک کا پہلا اَنّ تھا جو مدن اور صفدر نے منہ سے لگایا اور مدن کی آنکھوں میں پانی بھر آیا........

آج کی صبح جب ہونے کو تھی، مدن نے اس زمین پہ پہلا قدم رکھتے ہوئے

اپنی آنکھوں میں پانی آگیا دیکھا تھا اور اب جب صبح ہو چکی تھی تو اُس کی آنکھوں میں پھر پانی بھر آیا تھا۔ "مگر یہ پانی، پانی کا کیسا فرق ہے ــــ؟" مدن نے اپنے آپ سے پوچھا اور یہ فرق کھوجنے کے لئے دونوں آنکھیں مُوند کر چارپائی پر نڈھال سا عزت اور بے حرمتی کے بیچ فاصلے کو ناپتے ہوئے مدن تھک کر سوگیا تھا۔ جب جاگا تو دیکھا کہ صفدر بھی بے قرار ہو کر آزادی کا فاصلہ ناپ رہا تھا۔۔۔۔۔۔

مدن کو جاگتا دیکھ کر صفدر نے کہا کہ سنتری شام کی روٹی رکھ گیا ہے۔ مگر اس روٹی کی بھوک مدن کے اندر جیسے مرگئی تھی، کہنے لگا ــــ "پہلے یہ ذلّت گلے سے نیچے اُتار لوں، پھر روٹی بھی کھا لوں گا۔ ابھی تو گلے سے نہیں اُترے گی۔ تم کیا سوچتے ہو؟"

"میں اس سلوک کی وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن کوئی تُک اور منطق نہیں مِل رہا۔" صفدر نے کہا اور ساتھ ہی کہنے لگا ــــ "علاقے کے آفیسر ہمیں سمجھ نہیں پا رہے۔ شاید ان کا قصور نہیں، کیونکہ ہمارے پاس نہ پاسپورٹ ہیں، نہ ویزا۔ مگر میں نے اُن سے کہا ہے کہ وہ ماسکو کے آفیسروں کو ہماری اطلاع کر دیں، وہ سبھی مجھے جانتے ہیں۔ جب اُن سے حکم ملے گا تو یہ بے چارے پچھتائیں گے۔"

مدن اُس کی بات سے متفق تو ہوا لیکن کہنے لگا ــــ "پھر بھی ان کو ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آخر ہمارے قصوروار ہونے کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ان کو، ہمارے جسم کا انچ انچ ٹٹولنے کا کیا حق تھا؟ اگر مجھے روسی زبان آتی تو میں اِن لوگوں کو کھری کھری سُناتا۔۔۔۔۔۔"

صفدر نے مدن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دلاسہ دیا ــــ "وہ جو تم کہنا چاہو، میں اُسے روسی زبان میں بولتا جاؤں گا، لیکن مجھے ایک ہی افسوس ہے کہ آتے ہی تمہارے دل پر ان کا کیسا اثر پڑ گیا۔۔۔۔۔۔"

دونوں کے لئے جب سنتری نے چائے دی، بھلے ہی چائے دودھ کے بغیر تھی اور بدمزا بھی، پھر بھی اس کے گرم گھونٹ نے ان کے اندر کچھ گرمائش ڈالی۔ کالی ڈبل روٹی کے کچھ نوالے بھی چائے کے ساتھ نِگل لئے اور سو گئے۔

مدن سو رہا تھا۔ جب صفدر نے اُسے جھجھوڑ کر جگایا اور مدن نے دیکھا کہ صفدر کا چہرہ اُترا ہوا ہے۔

کوٹھڑی کے باہر کے برآمدے میں سے فوجی بوٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ صفدر نے کہا — "پختہ طور پر نہیں کہہ سکتا لیکن لگتا ہے کہ وہ ہمیں شوٹ کر دیں گے۔"

"کیا؟" مدن کا منہ ایک بار کھُلا، اور پھر کوٹھڑی کے دروازے کی طرح بند ہو گیا۔

صفدر کہنے لگا — "ابھی کچھ منٹ پہلے، ہماری کوٹھڑی میں ڈاکٹر آیا تھا۔ اُس نے کہا ہے کہ جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہاں اس طرح جب آدھی رات ڈاکٹر آتا ہے، تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ قیدیوں کو مار دیا جائے گا۔"

اور صفدر کی آواز ہکلا سی گئی — "تم ..... تم ..... میرا خیال ہے کہ ابھی ہمیں فائرنگ سکوئیڈ سے آگے لے جائیں گے ...... باہر فوج کا دستہ آ گیا لگتا ہے۔"

مدن نے پہلی بار صفدر کو اس طرح گھبراتے ہوئے دیکھا تو اُس کے اندر اپنے ہندو سنسکار جاگ اُٹھے۔ کہنے لگا — "موت سے صرف جسم کا چولا بدلتا ہے۔ اچھی بات ہے، پھر نیا چولا پہن کر دنیا میں آئیں گے۔ آتما تو امر ہوتی ہے ..."

مدن شاید دیر تک زندگی اور موت کے فلسفے پر کچھ کہتا رہتا، لیکن اُسی وقت کوٹھڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی چار ہتھیار بند فوجی سپاہی اندر

آ گئے۔ ان میں دو نے مدن اور صفدر کی باہیں کھینچ کر کوٹھڑی سے باہر اُن کو ایک ٹرک میں بٹھا دیا۔ وہاں ٹرک میں محمد کو بھی بٹھا رکھا تھا۔ ارد گرد بیس ہتھیار بند فوجی کھڑے ہو گئے۔

اور مدن نے دیکھا کہ تین اور ٹرک تھے، ہتھیار بند فوجیوں سے بھرے ہوئے جو اُن کے ٹرک کے دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف کھڑے تھے۔ ان تینوں ٹرکوں میں شین گنیں، ٹھکی ہوئی تھیں۔ صرف ان میں گھرا ہوا مدن، صفدر اور محمد والا ایک ہی ٹرک تھا جو اندھیرے سے بھرا ہوا تھا اور پھر ایک سیٹی پر چاروں ٹرک چلنے لگے ... پتہ نہیں کس طرف ......؟

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ٹرک کھڑے ہو گئے، اور اُن تینوں کو ٹرک میں سے اُترنے کے لئے کہا گیا۔ مدن نے دیکھا کہ سامنے گاڑی کے اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہے، اور لائن پر ایک گاڑی کھڑی ہے۔ مدن اور صفدر کو جب گاڑی کے ایک خالی ڈبے میں چڑھایا گیا تو پچاس سے بھی زیادہ ہتھیار بند فوجی اُس ڈبے میں آ کر، ان کے گرد بیٹھ گئے اور مدن نے دیکھا کہ وہ محمد کو کسی اگلے ڈبے میں بٹھانے کے لئے گئے ہیں۔

پھر رات بھر یہ گاڑی چلتی رہی اور دوپہر ہو گئی تھی جب وہ ایک اسٹیشن پر رکی، جہاں اُنہیں کھانے کے لئے کچھ دیا گیا۔ صفدر نے کھڑکی میں سے دیکھتے اسٹیشن کا نام پڑھا — "تختہ بازار"۔

پھر شام تک وہ گاڑی کہیں نہیں رکی۔ شام کے وقت جس اسٹیشن پر اُن کو اُتارا گیا، اُس کا نام "ماڑی" تھا۔ اور یہاں سے ان کو شہر کے تھانے میں لے جایا گیا۔ اُس تھانے میں صفدر اور مدن کو ایک ہی کوٹھڑی میں رکھا گیا، اور محمد کو دوسری الگ کوٹھڑی میں۔

یہ کوٹھڑیاں بہت گندی تھیں۔ مگر مشکل سے رات گذری تھی کہ اُن کو حاجت کے لئے باہر لے جاکر، چار ہتھیار بند قیدیوں کی نگرانی میں ایک اور گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اب محمد اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ دوپہر ہونے کے بعد ان کو جس اسٹیشن پہ اتارا گیا، وہ شہر "اشق آباد" کا اسٹیشن تھا۔ ترکمانیہ کی راجدھانی۔ شہر کی جس عمارت میں ان کو لایا گیا، صفدر نے اُس کا نام پڑھا ——— N.K.V.D اور مدن کو بتایا کہ یہ منسٹری آف انٹرنل افیئرز کی عمارت ہے۔

وہ چار ہتھیار بند فوجیوں کی نگرانی میں ایک لمبے برآمدے میں سے گذر رہے تھے کہ اچانک ایک فوجی، صفدر کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ یہ بات اتنی اچانک ہوئی کہ مدن اور صفدر کو آپس میں ایک بھی بات کرنے کا موقع نہیں مل پایا۔

۱۳

اب مدن اکیلا رہ گیا تھا........

جس کوٹھری میں مدن کو بند کیا گیا، وہ بہت چھوٹی تھی، مشکل سے ایک الماری جتنی۔ چھت اتنی نیچی تھی کہ اگر وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو تو اُس کا سر چھت سے ٹکرا جاتا تھا۔ اُسے روسی زبان نہیں آتی تھی، اس لئے صرف کچھ اشارے ہی اس کی زبان بن کر رہ گئے تھے اور پھر اس کی کوٹھری بند کر دی گئی، اندر چونکہ کوئی روشنی نہیں تھی، مدن کو لگا کہ وہ کسی کھائی میں گر پڑا ہے.........

پتہ نہیں، کب ایک سنتری آیا، جس نے مدن کو اشاروں سے سمجھایا کہ وہ سارے کپڑے اتار دے۔ اُس نے صابن کا ایک ٹکڑا بھی پکڑا دیا، جس سے مدن سمجھ گیا کہ اُسے غسل کے لئے کہا جا رہا ہے۔ کوٹھری کے باہر ایک غسل خانہ تھا۔

جہاں سنتری کے اشارے پر، اُس نے جا کر دیکھا کہ گرم پانی رکھا ہوا ہے۔ یہ پہلا غسل خانہ تھا۔ جو مدن کو پہلا انسانی برتاؤ لگا۔

اس کے بعد مدن کی کوٹھری بدل دی گئی۔ اس نئی کوٹھری میں دو چارپائیاں بھی تھیں، چٹائیاں بھی۔ ایک چارپائی پر کوئی سو رہا تھا، پتہ نہیں کون۔ مدن چپ چاپ دوسری چارپائی پر لیٹ گیا اور اونگھتی ہوئی آنکھوں سے صفدر کا تصور کرنے لگا۔ کہ اُسے روسی زبان آتی ہے، اب تک شاید اُس نے فوجی آفیسروں کے ساتھ کوئی بات چیت کر لی ہوگی اور صبح شاید......

اس 'شاید' لفظ نے مدن کی آنکھوں میں نیند بھر دی۔ رات کی پوری نیند لے کر جب وہ صبح جاگا تو دیکھا کہ اُس کی کوٹھری کا دوسرا ساتھی بند پنجرے کے شیر کی طرح کوٹھری میں ٹہل رہا ہے۔

مدن کو جاگتا ہوا دیکھ کر اُس آدمی نے فارسی زبان میں پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" مدن کو فارسی آتی تھی، اس لئے بتا سکا ——

"ہندوستان سے" وہ آدمی اپنی چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگا —— "میں ایران سے آیا ہوں، حسین، ایک چرواہا" اور اُس نے اپنی آپ بیتی سنائی کہ روس اور ایران کی سرحد پر وہ اپنے علاقے میں بھیڑیں چرا رہا تھا کہ کچھ بھیڑیں چرتی چرتی پرے چلی گئیں، روس والی حد میں۔ وہ بھیڑوں کو لوٹانے کے لئے اُن کے پیچھے گیا تھا کہ اچانک اُسے سرحدی فوجی سپاہیوں نے پکڑ لیا کہ وہ جاسوس ہے.....

مدن اور حسین کو ایک تسلی ہوئی کہ وہ آپس میں بات کر سکتے ہیں۔ ایک سنتری کو بھی ٹوٹی پھوٹی فارسی آتی تھی۔ جس سے کبھی کبھی مدن پوچھ بیٹھتا کہ اُس کی شنوائی کب ہوگی لیکن وہ کندھے جھٹک کر چپ رہ جاتا۔ اس طرح کوئی ہفتہ گزر گیا تو مدن کو ایک آفیسر کے آگے پیش کیا گیا، جس نے اُس کا نام پتہ اور عمر اپنے کاغذوں پر

درج کر کے ٹوٹی پھوٹی فارسی میں پوچھا ـــــ "تم ہردت، برطانیہ کے جاسوس؟" اس وقت مدن موہن ہردت نے چیخ کر بتایا ـــــ "میں سچا انقلابی ہوں، کسی قیمت پر بھی کسی کا جاسوس نہیں ہو سکتا۔ برطانیہ سے اپنے ملک کو آزاد کروانے کے لئے میں یہاں سیاسی ٹریننگ لینے کے لئے آیا ہوں۔ میں اور پروفیسر عبداللہ صفدر انگریزوں کی پولیس سے بھاگ کر یہاں آتے ہیں۔۔۔۔۔۔

آفیسر گرجا ـــــ" اس طرح اونچا بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو، تم ہمیں بہکا نہیں سکتے۔ سارے ثبوت مل چکے ہیں، اچھا ہو اگر تم خود ہی حلفیہ بیان دے دو۔۔۔۔۔۔"

ہردت غصّے سے چیخ اُٹھا، تو آفیسر نے ایک آدمی کو بلا کر اُسے پھر سے کوٹھری میں بند کر دیا۔ اُس وقت ہردت کو ایک ہی خطرہ محسوس ہوا کہ محمد نے ضروری بیان دیا ہوگا کہ روس میں ہمارا سونا گڑا ہوا تھا جسے کھوجنے کے لئے ہم آئے ہیں اور اس طرح میرا اور صفدر کا بیان محمد سے الگ ہو گیا ہوگا۔۔۔۔۔۔

او خدایا! ـــــ مدن نڈھال ہو کر چارپائی پر پڑ گیا۔

ایک دن دو سنتری اُسے کوٹھری میں سے نکال کر باہر لائے تو دیکھا کہ باہر کالے رنگ کی کتنی ہی گاڑیاں کھڑی ہیں۔ یہ اُسے بعد میں پتہ چلا کہ ان کالی گاڑیوں کو قیدیوں کی زبان میں "چورنی دوران" کہا جاتا ہے، یعنی بہاڑی کوا۔ اس وقت ہردت کو ایک کاغذ پکڑا دیا گیا، جس پر "۴۵" کا ہندسہ لکھا ہوا تھا۔ اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، لیکن بعد میں پتہ لگا کہ پہلی رات کی تلاشی کے وقت جو اس کا دس روپے کا نوٹ لیا گیا تھا، اس کے حساب میں سے یہ ۴۵ کوپیک بچتے تھے۔ اس نئی کوٹھری میں اُسے اُسی حساب میں سے ایک موٹا پاجامہ ملا تھا، کچھ فالتو روٹی اور ایک سیر چینی کی گولیاں بھی۔

قیدیوں کی یہ لاری جب ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو ان کو لاری میں سے نکال کر ایک بند ریل گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ وہ بند گاڑی اندر سے بھی لوہے کی جالیوں سے خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کوئی خانہ اکیلے قیدی کے لئے تھا کوئی دو دو، تین تین کے بیٹھنے کے لئے ہر خانہ بند ہو جاتا تھا لیکن اس کی ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، قیدی کو روٹی پانی دینے کے لئے۔ یہ خانے گاڑی میں ایک طرف تھے اور اُن کے سامنے چھوٹے سے گلیارے کی جگہ تھی، جہاں پستول لئے ایک پہرے دار گھومتا رہتا تھا۔

گاڑی کے ایک سرے پر پاخانہ بنا ہوا تھا اور دوسرے سرے پر پہرے داروں کے بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ پورے دن کے بعد رات کو یہ بند گاڑی ایک ٹرین کے ساتھ جوڑ دی گئی جو سات دن تک چلتی ٹرین کے ساتھ جڑی رہی۔

سات دن کے بعد یہ بند گاڑی اُس ٹرین سے الگ کر دی گئی اور ہردت نے دیکھا کہ اب سامنے پھر وہی "پہاڑی کوّتنے" لاریاں کھڑی ہوئی ہیں۔ گاڑی والے پنجرے میں سے نکال کر اُسے دیگر قیدیوں سمیت لاری میں بٹھایا گیا۔ وہ لاری جب ایک بڑی سی عمارت کے سامنے رُکی۔ تو عمارت کے اندر جاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ وہ بڑی صاف ستھری عمارت ہے۔ اُسے لگا گویا وہ ایک ہسپتال ہو۔۔۔۔۔۔

وہاں ایک کمرے میں پھر تلاشی لی گئی اور اس کے بعد اسے ٹائیلوں والے بڑے صاف ستھرے غسل خانے میں بھیج دیا گیا، جہاں اس نے بہت گرم پانی میں پچھلے سات دنوں کی میل، جتنی بھی دھوئی جا سکتی تھی، دھو ڈالی۔

ایک سنتری جب اُسے ایک کمرے کی طرف لے جا رہا تھا تو اُس نے برآمدے میں لگی ایک گھڑی دیکھی جس پہ گیارہ بجے ہوتے تھے۔ اب جس کمرے میں اُسے بند کیا گیا، وہاں چار چارپائیاں تھیں، جس میں سے صرف ایک خالی تھی، اُس کے لئے۔ کمرے

میں نیلے رنگ کا بلب جل رہا تھا، جس کی روشنی سے اوٹ کرنے کے لئے باقی تینوں قیدیوں نے آنکھوں پر تولئے رکھے ہوئے تھے۔ سنتری جب کمرے کو بند کر کے چلا گیا تو ایک نے آنکھوں سے تولیہ ہٹا کر مدن سے انگریزی میں پوچھا ــــــ "تم بھی کسی دوسرے ملک کے ہو؟"

"ہاں، میں ہندوستانی ہوں۔ یہ ہسپتال ہے؟" ہردت نے اُس سے پوچھا، تو وہ آدمی مسکرا دیا ــــــ "نہیں، یہ ماسکو کا قید خانہ ہے، ُلبیانکا۔ مگر اب چپ چاپ سو جاؤ، دس بجے کے بعد باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ صبح باتیں کریں گے۔"

"اُف، تو یہ ماسکو ہے!" ــــــ اور ملتھے میں پڑے ہوئے ماسکو کے سپنے بے چینی سے کروٹیں لینے لگے۔

پھر آہستہ آہستہ اُس نے اپنا اوورکوٹ اتارا، سر کی پگڑی اتاری اور پیروں کی چپلیں اتاریں اور چارپائی پر کمبل تان کر لیٹ گیا، اُس وقت سنتری دروازہ کھول کر اندر آیا اور مدن کے دونوں بازو کمبل سے باہر نکال کر، دونوں ہاتھ اس کی چھاتی پر اس طرح جوڑ کر رکھ دیئے۔ جیسے وہ پیار تمنا میں جوڑے ہوں۔ مدن نے باقی تینوں کی طرف دیکھا تو وہ بھی اسی طرح ہاتھ جوڑ کر لیٹے ہوتے تھے۔

صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ اس کمرے میں ایک طرف بڑا سا میز تھا جس پر کچھ کتابیں بھی تھیں اور شطرنج بھی۔ ایک طرف کونے میں لوہے کے ڈھکن والا کموڈ تھا جو روز صبح باہر جا کر خالی کرنا ہوتا تھا.... کیا یہی ماسکو ہے؟ اُس کا مکہ؟ ہردت کی چھاتی میں ایک ہول سا اٹھا لیکن ساتھ ہی تسکین بھی ملی کہ یہاں اُسے صفدر بھی ملے گا اور صفدر کے دوست آفیسر بھی جو اس بھیانک غلطی پر پچھتائیں گے اور اُسے لپٹ کر کہیں گے ــــــ "تم تو سچے انقلابی ہو، ہمارے

وفادار دوست ....“

اور اس کی خیالی تصویر میں مزید رنگ بھر اُٹھے۔ جب ناشتے کے لئے اُسے سفید ڈبل روٹی اور بہت سی چینی ملی۔ لیکن جب کمرے کا وہ ساتھی جس نے رات کو اُس کے ساتھ انگریزی میں بات کی تھی، ہنس کر کہنے لگا ”تم شاید جلدی آزاد ہو جاؤ گے بشرطیکہ تم نے ان لوگوں کا جاسوس بننا مان لیا ——“ تب ہروت کی خیالی تصویر کے رنگ دُھل گئے۔ کہنے لگا —— ”میں انہیں بتا چکا ہوں کہ نہ تو انگریزوں کا جاسوس ہوں اور نہ ہی کسی اور کا بن سکتا ہوں۔ میں اپنے ملک کی آزادی کے لئے یہاں صرف ٹریننگ لینے کے لئے آیا ہوں۔“

اُس وقت اُس کے کمرے کے ساتھی نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ آدمی لڈوگ سپیگا تھا، پولینڈ کی ڈپلومیٹک سروس میں۔ جب سوویت یونین اور جرمنی نے پولینڈ کا بٹوارا کیا، اُس وقت وہ وارسا شہر میں تھا۔ تب پولینڈ کے سرکاری طبقے کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی اور سپیگا تب سے یہاں لُبیانکا میں قید تھا.......

کمرے کے باقی دو ساتھی انگریزی نہیں جانتے تھے اس لئے سپیگا نے اُن کا تعارف مدن سے کرایا۔ اُن میں سے ایک نکیتا سید برینکو تھا، سپیگا سے کوئی دس سال چھوٹی عمر کا۔ مغربی یوکرین کا ایک انجینئر تھا اور سپیگا نے بتایا کہ جب مغربی یوکرین کے ہزاروں لوگ پکڑے گئے تو وہ بھی اُن میں سے ایک تھا۔ وہاں نیشنل موومنٹ بہت طاقتور تھی اور شاید نکیتا اُس کا ممبر تھا۔ مگر وہ کسی کے ساتھ بات چیت نہیں کرتا تھا، اس لئے اُس کے بارے میں سپیگا کو بھی صرف اتنا ہی معلوم تھا اور دوسرا تقریباً پینتیس سال کا اساق ذیلینکی ماسکو کا ایک کمیونسٹ یہودی تھا جو اس لئے پکڑا گیا کہ وہ ٹراٹسکی کا حامی تھا۔ سپیگا نے مدن کو مزید بتایا کہ ٹراٹسکی کے حامیوں کو اسٹالن سرکار نے اپنا دشمن مان لیا تھا اور چونکہ وہ سرکار کے دشمن تھے، اس لئے

عوام کے دشمن تھے۔ سپیگا کے الفاظ کے مطابق اِساق، اسٹالن کو انٹرنیشنل گینگسٹر سمجھتا تھا۔

ہروت کا بہت جی چاہا کہ وہ اِساق سے باتیں کرے۔ اُس نے تھوڑی سی روسی زبان ان دنوں میں سیکھ لی تھی مگر وہ روٹی، چینی، چائے پانی اور غسل جیسے الفاظ تک ہی محدود تھی . . . .

یہاں روزانہ ٹھیک چھ بجے صبح اُٹھنا ہوتا تھا اور باری باری سے کمرے کو صاف کرنا ہوتا تھا۔ پھر غسل خانے میں جاکر منہ ہاتھ دھو کر وہ واپس اپنی چارپائیوں پر بیٹھ سکتے تھے لیکن لیٹنے کی اجازت نہیں تھی، باتیں کر سکتے تھے، کمرے میں رکھی کتابیں پڑھ سکتے تھے یا شطرنج کھیل سکتے تھے۔ بیس منٹ کے لئے اُن کو چھت پر لے جاکر ہوا خوری کروائی جاتی تھی۔ اور دس دنوں کے بعد اُن کے بال کٹوا کر، گرم پانی کا غسل دے کر کپڑے بدلوائے جاتے تھے۔ اُن میں سے صرف ذیلینسکی تھا جو قید خانے کے اسٹور میں سے کچھ چیزیں خرید سکتا تھا، اس لئے وہ کئی بار سپیگا کو سگرٹ خرید دیتا تھا۔

آہستہ آہستہ ہروت نے اُس کمرے کی سیاست کو بھی پہچانا۔ سپیگا کو ذیلینسکی پسند نہیں تھا۔ اس کی نظر میں بولشیوک، مینشوک اور ٹراٹسکی اسٹ سبھی ایک سے تھے۔ وہ بحث کرتا اور کہتا کہ ڈکٹیٹر شپ اس آئیڈیالوجی کو وراثت میں ملتی ہے، اس لئے یہ الزام صرف اسٹالن پر کیوں؟ ٹراٹسکی ہوتا تو وہ بھی یہی کچھ کرتا۔

سپیگا کو شک تھا کہ ذیلینسکی "مخبر" ہے وہ مدن کو بتاتا کہ ایک کمرے میں رکھے جانے والے قیدی بڑی احتیاط سے چُنے جاتے ہیں جو ہم خیال نہ ہوں۔ کمرے کا سنتری اُن کے درمیان ہونے والی ہر بات پر کان رکھتا ہے اور اس کی خبر "اوپر" بھیجتا ہے۔ اُسی کے مطابق کسی قیدی کو زیادہ روٹی اور سگریٹ خریدنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اُسے سزا بھی کم ملتی ہے۔

مگر ہردت کے دل میں ذلیلینسکی کے لئے کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہوا۔ اُس کی نظر میں وہ کامریڈ تھا، انقلابی تھا۔ ذلیلینسکی انگریزی سیکھنا چاہتا تھا اور ہردت کو روسی زبان سیکھنے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا دونوں ایک دوسرے سے یہ زبانیں سیکھنے لگے اور سپیگا اس بات میں دونوں کی مدد کرتا رہا۔ کاغذ پنسل ہوتے تو سیکھنا آسان ہو جاتا لیکن زبانی یاد کرتے ہوئے بھی دونوں کو آہستہ آہستہ یہ زبانیں سمجھ میں آنے لگیں۔

سپیگا کو یورپ کے سیاسی حالات کا خاصہ علم تھا۔ ہردت کو بھلے ہی کئی باتوں پر اُس سے اختلاف تھا لیکن وہ سپیگا کی عزت کرتا تھا۔ سپیگا کا کہنا تھا کہ ہٹلر نے جو ہتھکنڈے پولینڈ کے لئے برتے ہیں، وہی ایک دن رُوس کے خلاف بھی برتے گا۔ ہردت کا خیال تھا کہ پولینڈ پر ہٹلر کے حملے کا سوویت یونین ذمہ دار نہیں ہے، یہ برطانیہ اور امریکہ نے پولینڈ سے وشواس گھات کیا ہے۔ مگر تین ماہ بعد اُس نے جانا کہ سپیگا سچ کہتا تھا۔ کیونکہ تب سوویت یونین پر جرمن حملے کی خبر آ گئی تھی . . . . .

مہاتما گاندھی کے بارے میں ہردت کا کہنا تھا کہ عدم تشدد اور پُرامن مخالفت سے آزادی کی جنگ نہیں لڑی جا سکتی۔ اس پر اُس نے پہلی بار دیکھا کہ ہمیشہ چپ رہنے والا سیدیرینکو غصے میں آ گیا اور کہنے لگا ــــ ”تم دیش بھگت کیسے ہو سکتے ہو، جب کہ تم اپنے آپ کو کمیونسٹ سمجھتے ہو۔ کمیونسٹ کی وفا اپنی آئیڈیالوجی کے ساتھ ہوتی ہے، ملک کے ساتھ نہیں ہوتی۔ میں نے بھی اپنے لوگوں کے لئے آزادی چاہی تھی، جس طرح تم اپنے لوگوں کے لئے چاہتے ہو۔ مجھے بہت کچھ دینے کی پیشکش کی گئی بشرطیکہ میں اپنی تنگ نظر دیش بھگتی سے کنارہ کشی کر لوں۔ میں اپنے لوگوں کی قیمت پر یہ سودا کبھی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے عوام کی بہشت میں میں قیدی ہوں . . .“

سیدیرینکو طیش میں آ جانے والا آدمی تھا، اس لئے ہردت نے اُس کے ساتھ بحث نہیں کی۔ یہ بحث اُس نے اپنے آپ سے کی ــــ ”سیدیرینکو کی وفا کن لوگوں

کے ساتھ ہے؟ اپنے طبقے کے لوگوں کے ساتھ۔ یہ محنت کشوں اور مزدوروں کے ساتھ نہیں۔ ان کی آزادی کے ساتھ نہیں۔۔۔۔۔"

اس طرح دو ہفتے گزر گئے کہ دو سنتری ہردت کو کمرے میں سے باہر لے گئے۔ ایک جگہ ایک سنتری سے دستخط کروا کر ایک چِٹ دی گئی۔ اب اگلے برآمدے سے باہر، پیروں کے نیچے ربڑ کا فرش نہیں تھا، وہاں موٹے قالین بچھے ہوئے تھے۔ وہاں ایک کمرے میں ہردت کو ایک آفیسر کے آگے پیش کیا گیا۔ آفیسر نے ہردت کو کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہہ کر کہا کہ اس کے مقدمے کی تفتیش اس کے پاس ہے۔ اتنے میں ایک پیاری سی لڑکی کمرے میں آ کر چائے، چینی، لیمو کے ٹکڑے اور سینکے ہوئے ٹوسٹ دے گئی۔ آفیسر نے ہردت کو چائے پینے کے لئے کہا تو اس دوستانہ رویے پر اس کا جیسے گلا سوکھ گیا۔۔

اس نے چائے پی لیکن ان کے بیچ بات چیت کے لئے جو تاجک انٹرپریٹر بلایا گیا تھا، اس کے ذریعے بات چیت میں اتنی مشکل پیش آئی کہ ایک سنتری بلا کر اسے پھر اس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ مگر اسے تسلی ہوئی کہ آخر شنوائی ہونے لگی ہے۔ اور وہ بھی دوستانہ رویے سے۔ لیکن پانچویں دن پھر جب اسے اس آفیسر کے سامنے پیش کیا گیا، ایک انٹرپریٹر عورت کے تعاون سے، تو آفیسر کا لہجہ ٹھنڈا اور سخت تھا۔ نام و پتہ اور عمر وغیرہ کاغذ پر درج کرنے کے بعد آفیسر نے پوچھا ـــ "ہردت، اب تم سمجھ گئے کہ جاسوس کے طور پر تم نے سوویت یونین میں داخل ہو کر کتنا سنگین جرم کیا ہے؟"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا، کیونکہ میں جاسوس نہیں ہوں۔" ہردت نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تم یہاں آئے کیوں ہو؟"

"میں نے اشق آباد میں بھی بتایا تھا کہ میں سیاسی ٹریننگ لینے کے لئے آیا ہوں۔"

"اگر یہی وجہ ہے تو اب تم کو قید میں کیسا لگتا ہے؟"

"میرا نظریہ نہیں بدلا۔ میں کمیونسٹ انقلابی ہوں۔ اب بھی میری ایک ہی خواہش ہے۔ کہ اپنے سے زیادہ سمجھ دار اور تجربہ کار کامریڈوں سے میں کچھ سیکھ سکوں۔"

"پھر کل عالمی انقلاب کے لئے تم سوویت یونین کے لئے کام کروگے؟"

"نہیں، میرا جاسوسی میں یقین نہیں ہے۔ میرا یقین انقلابی جدوجہد میں ہے۔"

"مگر، ہمیں معلوم ہے کہ تم برطانوی جاسوس ہو۔ یونہی ہمارا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ جتنی جلدی تم اپنے جرم کا اقبال کرلو، اتنا ہی اچھا ہے۔"

"لیکن میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے، اقبال کس کا کروں؟ میری وفا اپنے ملک کے ساتھ ہے۔ میں برطانیہ کا جاسوس کیسے ہو سکتا ہوں؟"

آفیسر نے میز پر زور سے مکا مارا اور کڑکتی آواز میں کہا ——— "ہمیں جتنے ثبوت چاہیئے تھے مل چکے ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ ہم لوگوں نے تمہیں یوں ہی گرفتار کرلیا ہے؟ تمہارے حلفیہ بیان کے کاغذات تیار کر کے تمہیں دے دیئے جائیں گے، دستخط کے لئے۔ تمہارے جیسے دو طرفہ آدمیوں کے ساتھ ہم نپٹنا جانتے ہیں......"

ہردت کرسی پر بیٹھا غصے سے کانپنے لگا......

اُسے کمرے میں واپس بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ چارپائی پر بیٹھ کر سامنے والی سفید دیوار کو تکنے لگا ——— جو دیوار اُس کا مقدر بن گئی تھی......

اگلی صبح پیپگا، ہردت سے اُس پر گزری بیتی سُن کر جب حیران نہیں ہوا تو ہردت نے حیران ہو کر کہا ——— "میں اس جرم کا اقبال کس طرح کروں، جو جرم میں نے کیا نہیں!"

اس پر پیپگا مسکرا دیا ——— "آج لاکھوں لوگ سوویت جیلوں میں بھرے ہوئے ہیں، تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ سبھی جاسوس ہیں؟"

ہردت نے طیش بھرے لہجے میں کہا ——— "مگر میں جھوٹے بیان پر دستخط نہیں

کروں گا۔" اور سپیگا نے مسکرا کر کہا — "وہ اس طرح کے دستخط کروانا جانتے ہیں۔"

اسی بے چینی میں مہینہ گزر گیا۔ ہروت کی پھر سنوائی نہیں ہوئی۔ مگر اُسے جو رعائتی خوراک ملتی تھی وہ بند ہو گئی۔ سپیگا نے اُسے بتایا کہ اُسے بھی رعائتی خوراک ملتی تھی، چاکلیٹ اور سگریٹ بھی، لیکن جب اُس نے روس کا جاسوس بننے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا تو وہ بڑھیا خوراک بند ہو گئی تھی۔

ہروت کی سپیگا سے بڑی عجیب و غریب دوستی ہو گئی۔ اُس کی سوجھ بوجھ اور عقلمندی کی وہ قدر کرتا تھا لیکن اُس کے طرزِ فکر کو وہ رجعت پسندانہ قرار دیتا تھا اور بحث کرتا کہ انہوں نے ہمیں پہلے ہی غلطی سے قید کر لیا ہے لیکن اس کے ساتھ بنیادی اصول کس طرح غلط ہو گئے؟

سپیگا اُس سے کہتا — "تم آدرش وادی ہو، ہروت۔ تم اتنا نہیں دیکھتے کہ بنیادی اصولوں کی اگر کوئی جگہ ہوتی تو سارا فلسفہ ایک ہی آدمی کے اشاروں پر کیوں چلتا؟ لینن کی موت کے بعد اسٹالن اُن لوگوں کا قتل کیوں کرواتا جو سوشلزم کے خلاف نہیں تھے۔ بلکہ اسٹالن کے طور طریقوں سے متفق نہیں تھے؟ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ لینن کے مروانے میں بھی اسٹالن کا ہاتھ تھا......"

مگر ہروت کی آنکھیں اپنے نظریہ سے ہل نہیں پائیں۔ وہ کہتا — "لیکن جو کچھ سوویت یونین نے اتنے تھوڑے سے وقت میں کر دکھایا ہے، وہ دنیا میں کہیں نہیں ہوا۔"

اب تک ہروت نے کچھ سمجھنے سمجھانے لائق روسی زبان سیکھ لی تھی اور ذیلینسکی نے انگریزی۔ ہروت اُس سے اسٹالن اور ٹراٹسکی کے درمیان کے بنیادی فرق کو سمجھنا چاہتا تھا۔ جس کے لئے ذیلینسکی نے اُسے لینن کے اس خط کا حوالہ دیا، جو آخری وقت اُس نے اسٹالن اور ٹراٹسکی کے علاوہ پارٹی سنٹرل کمیٹی کے باقی سب

ممبروں کو لکھا تھا کہ اسٹالن ایمان دار، لگن سے کام کرنے والا اور بہادر انقلاب پسند ہے، لیکن وہ سیاسی دور اندیشی میں کم ماہر ہے۔ بنا سوچے سمجھے بہت جلد بازی سے قدم اٹھا لیتا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اس کی جلد بازی اسے ڈکٹیٹرشپ کی طرف لے جائے گی۔ وہ انقلاب کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے ہتھے بھی چڑھ سکتا ہے۔ مگر ٹراٹسکی سنجیدہ سبھاؤ کا ہے، اس لئے وہ مخالف رائے کو بھی سلیقے سے سن سکتا ہے۔ آنے والے وقت میں کئی نئے مسائل، نئی اور پیچیدہ مشکلیں سامنے آئیں گی، جن کو بڑے ڈھنگ سے نپٹنا ہوگا۔ اس لئے میری رائے ہے کہ بلشوک پارٹی کا جنرل سیکریٹری ٹراٹسکی کو چنا جانا چاہیئے۔

اس طرح کا بحث مباحثہ چل رہا تھا کہ ایک شام کوئی چھ بجے ہردت اور پییگا کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا، جہاں آٹھ چارپائیاں تھیں۔ جن میں سے پانچ دوسرے قیدیوں کے پاس تھیں۔ اُن میں سے ایک بوڑھے سے قیدی نے ہردت کی طرف اشارہ کرکے پییگا سے پوچھا — "یہ ہندوستانی ہے؟" اور پییگا نے بتایا کہ ہاں یہ ہندوستانی ہے، تب وہ بوڑھا قیدی کہنے لگا — "یہ جس طرح کمرے میں آکر، تن کر کھڑا رہا، میں سمجھ گیا تھا کہ یہ ہندوستانی ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ایم، این، رائے یاد آگیا......"

ہردت جلدی سے اُس کی طرف بڑھا — "آپ ایم، این، رائے کو جانتے تھے؟" اس پر اُس نے ہردت کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا — "ہر سچا انقلابی اُسے جانتا تھا۔ لینن اسے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ بہت بڑا انقلابی تھا اور بہت ذہین۔ جب وہ پارٹی کا ممبر تھا، میں اُس سے ملا تھا........"

یہ بوڑھا آدمی پوری ستکلو تھا جس نے اودیسہ میں محنت کشوں کی پہلی

سوشلسٹ مزدور پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ اُسے زار کی خفیہ پولیس نے پکڑ لیا تھا اور اُسے دس سالوں کے لئے سائبیریا کے ورکتا نامی علاقے میں جلاوطن کر دیا تھا۔ پانچ سال کے بعد وہ فرار ہو کر جب سوئٹزرلینڈ پہنچا تو وہاں لینن کے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی تھی اور وہ ۱۹۰۵ء میں روس لوٹ کر بلشوک ٹکٹ پر روسی ڈوما (اسمبلی) کا ممبر چنا گیا تھا۔ زار سرکار نے اُسے پھر جلاوطن کر دیا تھا لیکن وہ بلشوک انقلاب کے بعد پھر لوٹ آیا تھا اور ۱۹۱۷ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک اخبار "ازویستیہ" کا ایڈیٹر رہا تھا۔ اسٹالن سے کئی باتوں میں اس کی مختلف رائے ہوتی تھی، اس لئے وہ کونٹر ریوولیوشنری کے الزام میں اب قید تھا...... اور کھلے لفظوں میں وہ تفتیش کے آفیسروں کو "بیریہ کی بدبو" کہتا تھا۔ اس کے خیال میں اسٹالن بالکل بے خبر تھا اور یہ خوفناک حالتیں بیریہ کی ایجاد تھیں۔

اس نئے کمرے میں ایک چپ اور شرمیلا سا اکیس سالہ لڑکا تھا جسے ہردت نے باتوں میں لگا کر پوچھا کہ وہ کیوں قید ہے؟ اس نے کچھ جھجک کر کہا —— "پتہ نہیں، لیکن وہ کہتے ہیں کہ میں کمیونزم کے خلاف ہوں۔ مجھے کوئی نہیں بتاتا کہ کمیونزم کیا ہے؟ اگر تم کو پتہ ہے تو بتاؤ کہ وہ کیا ہوتا ہے؟"

ہردت سر جھکا کر چارپائی پر بیٹھ گیا......

پھر جون کا دوسرا ہفتہ تھا۔ لُبیانکا میں چودہ ہفتے گذارنے کے بعد جب ہردت کو وہاں سے نکال کر ماسکو کے ایک اور قید خانے "بُٹرکا" میں ڈال دیا گیا۔

یہ قید خانہ، لُبیانکا جیسا نہیں تھا۔ ہردت کو ایک بہت چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ تھوڑے دن گزرے تھے جب ایک آفیسر کے سامنے اُسے پیش کیا گیا۔ اُس نے حیران ہو کر دیکھا کہ یہ وہی پہلا آفیسر تھا وہی اُس کی انٹرپریٹر لڑکی تھی۔ اُسے ایک کونے میں بٹھا کر وہ آفیسر اور وہ لڑکی شراب پینے لگے۔

اور ساسیج کھانے لگے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے ہردت کے سامنے انگریزی میں ٹائپ کئے ہوئے کئی کاغذ رکھ کر اُسے قلم پکڑائی دستخط کرنے کے لئے اور بتایا کہ تفتیش ختم ہو گئی ہے۔

"تفتیش تو ہوئی نہیں۔ میرا دوست صفدر کہاں ہے؟ اُس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا گیا، کچھ بھی نہیں پوچھا گیا۔۔۔۔۔۔۔" ہردت نے غصے سے کہا، تو وہ آفیسر کڑک کر بولا —— "تم ہمیں تفتیش کرنی سکھاؤ گے؟"

"لیکن یہ کاغذات کاہے کے ہیں۔"

"تفتیش ختم ہونے کے، اور کاہے کے۔۔۔۔۔۔"

ہردت نے کچھ کہنا چاہا، مگر دیکھا کہ شنوائی تو ہو نہیں سکتی۔ لہذا ہر صفحے پر، جہاں وہ لڑکی اشارہ کرتی گئی، ہردت نے دستخط کر دیئے۔ اس نے لمبے لمبے صفحوں میں سے کچھ حرف پڑھنے کی کوشش کی، لیکن اُسے لگا کہ ہر لفظ کی گولائی پگھل کر ایک لمبی لکیر بن گئی ہے۔۔۔۔۔۔ قید خانے کی سلاخوں جیسی۔

۲۴

۲۳، جون ۱۹۴۱ء کی صبح تھی، جب ایک سنتری نے ہردت کو چپکے سے بتایا کہ کل جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا ہے۔ ہردت کو پیدنگا بہت یاد آیا جس نے چار مہینے پہلے پیشین گوئی کی تھی۔ ہردت اکیلا بیٹھ کر، جرمن، روس معاہدے کے ٹوٹنے سے برطانوی اور امریکی سیاست کے ہتھکنڈوں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اگلی دوپہر کا وقت تھا جب اُسے باہر کے ہال کمرے میں لایا گیا، جہاں قیدیوں کی کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ شام تک یہ بھیڑ بڑھتی گئی اور قیدی آپس میں اس جنگ

کی باتیں کرتے ہوئے کبھی یہ قیاس لگانے لگتے کہ آج وہ اچانک رہا کر دیئے جائیں گے۔ اور کبھی یہ خدشہ محسوس کرتے کہ آج سب کو گولی سے مار دیا جائے گا.....

رات کو کوئی دس بجے کا وقت تھا جب ہزاروں قیدیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر انہیں باہر کے صحن میں لایا گیا اور کالے پہاڑی کوّے، نامی لاریوں میں بھر دیا گیا۔ ہر دت والی لاری بھی اتنی ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھی کہ وہ کھانسی، پسینے اور بدبو سے لدی ہوئی لگتی تھی۔ یہ لاری جب ایک جگہ رُکی، صبح کا سورج چڑھ آیا تھا۔

یہاں سے قیدیوں کو ایک لمبی گاڑی میں بھر دیا گیا۔ کئی گھنٹوں کے بے چینی بھرے انتظار کے بعد قیدیوں کو کالی روٹی کے ٹکڑے اور نمک والی کچی مچھلی کھانے کو ملی۔ جب سورج غروب ہو گیا، تب اُن کی گنتی ہوئی اور گاڑی چل پڑی۔

وہ گاڑی پھر دو دن تک کہیں نہیں رُکی۔ تیسری رات جہاں گاڑی رُکی، وہ وانگا دریا کے کنارے کا شہر سراتود تھا۔ لیکن قیدیوں کو کھڑی گاڑی میں سے اگلی صبح باہر نکالا گیا اور پانچ پانچ کی قطار بنا کر زمین پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ ہتھیار بند سپاہیوں کے پاس زنجیروں سے بندھے خونخوار کتے تھے، تو بھی حکم دیا گیا کہ جو بھی کھڑا ہو گا، اسے گولی مار دی جائے گی۔ اُس وقت ان کی گنتی کرنے سے ہر دت نے اندازہ لگایا کہ پوری گاڑی میں ڈھائی ہزار قیدی تھے۔

حکم ملا — "شاگم مارش"، یعنی آگے بڑھو۔

قیدی اسٹیشن سے شہر کی جیل کی طرف چلنے لگے۔ ان کے ارد گرد پانچ سو ہتھیار بند سپاہی تھے اور ایک سو کتے۔

یہ نئی جیل پورے ایک شہر جتنی تھی، جس کے اندر کتنی ہی عمارتیں تھیں۔ اُس

بس کئی قیدی عرصے سے کھوئے ہوئے دوستوں کو ڈھونڈ رہے تھے، ہردت بھی صفدر اور محمد کو ڈھونڈنے لگا۔ صفدر تو نہیں، لیکن اچانک اُسے محمد دکھائی دے گیا، جس کو گلے سے لگاتے ہوتے ہردت نے پوچھا ــــ "تم نے کہیں میرے بھائی صفدر کو دیکھا ہے ؟" محمد تڑپ کر بولا ــــ "اُس کا نام نہ لو۔ اب میں جان گیا ہوں کہ وہ تمہارا بھائی نہیں تھا، وہ مُلّا بھی نہیں تھا۔ وہ جاسوس تھا۔ اُسے خدا کی مار، جو مجھے میری بیوہ ماں سے چھین کر یہاں لے آیا۔ . . . ."

ہردت نے بہت سمجھایا کہ اگر، ہم یہاں پھنس گئے ہیں تو یہ اُس کا قصور نہیں ہے۔ مگر محمد کہنے لگا ــــ "پھر تمہیں حقیقت کا علم نہیں ہے۔ اُس نے ہمیں کہا تھا۔ کہ یہاں اُس کا سونا گڑا ہوا ہے۔ اُس نے یہ بات تم کو بھی دھوکا دینے کے لئے بنائی تھی ــــ تم کو اور مجھ کو یہاں دوزخ میں ڈالنے کے لئے۔ . . . . ."

اب ہردت اُسے کسی بھی طرح یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ صفدر نیک نیت تھا۔ اس کا سچ مچ یقین تھا کہ ہمارے روسی دوست محمد کو، ہماری مدد کرنے کے بدلے میں کچھ انعام دے کر خوش کر دیں گے۔ . . . . .

"سب باتیں کس طرح اُلٹی پڑ گئیں! یہ تو سب سیدھی تھیں!" ہردت نے کہنا چاہا۔ مگر اُس کی آواز اُس کے تالو سے ٹکرا کر اُس کی زبان پر ٹوٹ گئی۔ . . . .

اُس نے محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا کہ اُس کو بُلا کر اُسے قیدیوں کی اُس بڑی کوٹھری میں لے جایا گیا، جو چالیس قیدیوں کے لئے بنی ہوئی تھی۔ لیکن اُس میں ساٹھ آدمی دھکیل دیئے گئے تھے۔ . . . . .

قیدیوں کی اتنی خوفناک حالت، ہردت نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ چھ بجے شام کو، دن کا دوسرا کھانا ملا تھا، جو کوٹھری میں رکھے میز پر سُوپ یعنی "شوربے" کے بڑے سلنڈر جیسے برتن کی صورت میں رکھ دیا گیا تھا۔ ہر قیدی کو مٹی کا بنا پیالہ دے

دیا گیا، جس میں چھ سات سو گرام پانی سما سکتا تھا۔ جب قیدیوں کو آدھا لیٹر شوربہ، دیا جانے لگا تو ہردت نے دیکھا کہ کئی قیدی وہ شوربہ، پینے کے لئے قطار کے پچھلے حصے میں کھڑے ہو گئے تاکہ اوپر اوپر سے پانی سا پینے کے بجائے وہ نیچے کا کچھ گاڑھا سوپ لے سکیں۔ بھوک سے سبھی کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور دوسرے سے تیسرا فقرہ بولتے ہوتے اُن کی طاقت ٹوٹنے لگتی تھی ......

رات کے دو بجے کوٹھری میں آئے نئے قیدیوں کو جگا کر اور حمام والی عمارت میں لے جا کر اُن کے بال کٹوائے گئے۔ وہ حجام بھی پرانے قیدیوں میں سے تھے۔ جو سردی سے کانپتے ہوئے نیلے پڑ رہے تھے ......

ان نئے قیدیوں کے کپڑے اتروا کر غسل کے لئے تیار کیا گیا تو ایک سنتری نے صابن کے گھول میں برش کو ایک بار ہر قیدی کی پیٹھ پر پھیرا اور ایک بار چھاتی پر۔ آگے پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ غسل خانے کے چار نلوں میں سے تین ٹھنڈے پانی کے تھے اور ایک گرم پانی کا، جس کی دھار اتنی پتلی تھی کہ اُس کے پانی کے انتظار میں ایک ایک قیدی کو کتنی دیر تک کھڑے رہنا پڑتا تھا، سردی سے تھر تھر کانپتے ہوئے ......

اس "سراتوو،، جیل میں مہینے میں ایک بار قیدیوں کے بال کٹوا کر غسل دیا جاتا تھا۔ ہردت کی کوٹھری کی جب ایسی تیسری باری آئی تو اُس نے دیکھا کہ اس بار حجام نہیں تھے۔ حجامنیاں تھیں یعنی بال کاٹنے والے مرد کی جگہ بال کاٹنے والی عورتیں۔ قیدیوں کے کپڑے اتروا کر جب قیدیوں کو ننگی عورتوں کے سامنے قطار میں کھڑا کیا گیا تو ہردت قطار کے آخر میں جا کھڑا ہوا تاکہ اس ذلت سے کچھ منٹ مزید بچ جائے۔ اُس وقت قطار کے اگلے حصے میں سے اُس نے کسی قیدی کی آواز سُنی ——— "دوستو! دیکھو! یہ ملک ہے جہاں عورتوں کو بھی برابر کے حقوق ملے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے حجامت کروانے سے انکار کر دیا، تو آپ پرانے وقیانوسی خیالوں کے گنے جائیں گے اور

آپ پر انقلاب دشمن ہونے کا سنگین جرم لگ جائے گا۔ لہذا، آؤ، انقلاب کے حامی بن جاؤ۔،،

اس جیل میں قیدی بٹے ہوئے تھے۔ ایک عام قیدی تھے، ایک خاص قیدی خاص اس لئے کہ وہ سیاسی تھے اور اس لئے ان کو ،،سلیپ واکر،، کہا جاتا تھا۔ اور دوسروں کو بال کاٹنے، کھانا بنانے، کپڑے دھونے وغیرہ کے کاموں پر لگا دیا جاتا تھا۔ ہردت نے دیکھا کہ وہ ،،دوسرے،، کچھ فائدے میں رہتے تھے۔ کیونکہ ان کو کچھ زیادہ کھانے کا موقعہ مل جاتا تھا۔

یہاں ہردت نے یہ بھی جانا کہ سیاسی مجرموں میں سے ایک فیصدی سے زیادہ کوئی نہیں تھا، جس کی سوویت یونین کے خلاف کوئی آئیڈیالوجی تھی۔ وہ صرف انجانے میں ہی سیاسی مذاق سنتے یا سناتے ہوئے سوویت نظام کے مخالف قرار دے دیئے گئے تھے۔

اس قید خانے میں صبح کی خوراک، کالی ڈبل روٹی اور ایک چمچ نمک تھی جب کہ اُبلے پانی کا ایک بڑا گول کنستر میز پر رکھ دیا جاتا تھا۔ دوپہر کو شوربے کے نام پر اُبلے پانی میں کالی روٹی کے خشک سوکھے ہوئے ٹکڑے یا بند گوبھی کے پتے اور پیاز کے موٹے چھلکے تیرتے دکھائی دیتے تھے اور رات کو نمکین کچی مچھلی کا ٹکڑا ہوتا تھا اور بڑے گول کنستر کو اُبلے پانی سے دوبارہ بھر دیا جاتا تھا۔ مگر جوں جوں جنگ بڑھتی گئی، یہ خوراک، مزید کم ہوتی گئی۔۔۔۔۔

ایک دن بیس منٹ کی ہواخوری کے دوران ایک نوجوان قیدی نے لوہے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ڈھونڈ لیا۔ جسے وہ چھپا کر کوٹھری میں لے آیا اور مٹی کے پیالے پر گھسا کر اُسے تیز کر لیا اور اپنا گلا چیر لیا۔ خودکشی کی اس کوشش کے بعد اب قیدیوں کی ہر کوٹھری کی مہینے میں تین چار بار تلاشی ہونے لگی تاکہ کوئی قیدی زندگی، کے

خلاف یہ فالتو مظاہرہ نہ کرے۔

جنگ کی خبر کسی نہ کسی دراڑ میں سے اندر آجاتی تھی کہ جرمن فوجیں جیت رہی ہیں انہوں نے روس کا بہت سا مغربی علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔۔۔۔۔۔اور قیدی اپنی گھٹتی ہوئی زندگی میں ایسی خبروں کا اس طرح انتظار کرتے، گویا یہ خبریں آکسیجن ہوں۔

ہردت نے سُنا تھا کہ اکتوبر انقلاب کے بعد، خانہ جنگی کے دوران بھی بھوکے اور غیر مسلح لوگوں نے لڑکر اپنے ملک کو غیر ملکی مسلح مداخلت سے بچالیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اب اپنے ملک کی حفاظت میں لوگوں کا وہ جذبہ کیوں نہیں رہا تھا؟ وہ روسی روح کہاں چلی گئی تھی؟ وہ یہ سوچنے سے انکاری تھا کہ جرمن فوجیں، روسی فوجوں کو جیت سکتی ہیں۔۔۔۔۔۔

وہاں اس کوٹھڑی میں جن بزرگ قیدیوں سے ہردت کی بات چیت ہوا کرتی تھی، انہوں نے ہردت کو بتایا کہ لینن عوام کے دلوں کا خدا بن گیا تھا۔ اُس نے عوام کو زار کی غلامی سے آزاد کرایا تھا۔ انسان کے لئے کسی نہ کسی خدا کا تصور ضروری ہوا کرتا ہے۔ اس لئے عوام نے خیالی خدا کی بجائے جب لینن میں حقیقی خدا دیکھ لیا تو ان کے نہتے ہاتھوں میں بھی بلا کی طاقت آگئی تھی۔ لیکن اسٹالن کے وقت انہوں نے جب دیکھا کہ اتنا مانا ہوا اسٹالن ان کو بیریہ کے پیدا کردہ ہیبت ناک ماحول میں سے نہیں نکال سکتا، تب ان کا خدا اپنے آسن سے ہل گیا اور اس لئے اُن کی ساری طاقت اُن کے پیروں میں سے نکل گئی ہے۔۔۔۔۔۔

ہردت کے لئے یہ بھیانک اطلاع تھی کہ بیریہ غیر ملکی طاقتوں کا خوفناک آلہ کار بن کر سوویت زمین پر قہر توڑ رہا ہے۔۔۔۔۔۔

سال بیتنے کو ہو آیا۔ اس دوران ہردت نے کسی نئے آئے قیدی سے

باہر کی صرف یہ خبر سنی کہ ۱۹۴۲ء میں چرچل آیا تھا، اسٹالن سے ملنے کے لئے.....
جواں قیدی مہینوں میں بوڑھے ہونے لگے تھے، تپ دق کے مریض ہونے لگے تھے۔ ہردت نے گھبرا کر کچھ دن ہسپتال میں پڑنا سوچا جس کے لیے صبح والے چمچ بھر نمک میں سے کچھ نمک بچا بچا کر اس نے تین چمچ نمک جمع کر لیا اور ایک دن وہ نمک گرم پانی میں گھول کر پی گیا۔ اُسے جب اُلٹیاں آنے لگیں، پیٹ میں بل پڑنے لگے تو اُسے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ لیکن وہاں پہنچ اُس نے دیکھا کہ ہر روز ایک دو مریض مر جاتے ہیں۔ ہسپتال میں اسپرین کے علاوہ اور کوئی دوا نہیں تھی۔ جو مریض مر جاتا تھا، باقی مریض اُس کی بچ گئی روٹی پر جھپٹنے کے سوا کچھ نہیں کر پاتے تھے........ ایک ڈیڑھ ہفتے بعد ڈاکٹر نے معائنہ کیا کہ ہردت کو کوئی بیماری نہیں ہے، اس لئے ہسپتال سے اُسے خارج کر دیا گیا۔

۱۹۴۲ء کے ماہ اگست کے آخری دن تھے جب ایک دن اچانک ہردت کو ایک آفیسر کے سامنے پیش کیا گیا، جس نے اُس کا نام و پتہ پوچھ کر ایک کاغذ پر اُسے دستخط کرنے کو کہا۔ اور بتایا کہ چوراسی دفعہ کے تحت اُسے تین سال کی سزائے قید سنائی گئی ہے۔

"کاہے کی سزا؟" ہردت نے جب حیرانی سے پوچھا تو بتایا گیا کہ بلا اجازت سوویت سرحد پار کرنے کی سزا۔ مگر جب ہردت نے یہ پوچھا کہ اُسے کسی عدالت کے سامنے پیش کیوں نہیں کیا گیا، تب آفیسر نے صرف اتنا ہی کہا ــــــ "یہ سزا او۔ ایس نے سنائی ہے۔" اور یہ بتلانے سے انکار کر دیا کہ یہ او۔ ایس کیا چیز ہے۔

ہردت نے دستخط کر دیئے اور جب اُس کاغذ کو آفیسر نے جھپٹ کر ہردت کے ہاتھ سے چھین لیا تو ہردت کے ہندو سنسکار چیخ کر بولے ــ "چوراسی لاکھ یونیوں کا چکر تو سنا تھا، لیکن یہ چوراسی دفعہ نہیں سنی تھی؛ جہاں منصف کی صورت بھی نہیں دیکھی اور آدمی مجرم بن گیا......

۱۵

اب ہردت کو وقتی انتظار والی ہال کوٹھری میں ڈال دیا گیا، جہاں بہت سے قیدی پہلے ہی موجود تھے۔ اُن کو بھی لمبی لمبی سزائیں سنائی جا چکی تھیں۔ یہ قیدی اس تقدیر پر خوش تھے کہ قید خانے سے لیبر کیمپ بہتر ہیں، جہاں کھلی ہوا ہوگی۔ بھلے ہی وہاں کمر توڑ مشقت کرنی ہوگی لیکن روٹی تو یہاں سے زیادہ ہی ملے گی۔

ہردت کا خیال تھا کہ اس "ویٹنگ ہال" میں مشکل سے ایک دو دن گزریں گے، مگر جب کئی ہفتے گزر گئے تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا سارا جسم کالے پھوڑے پھنسیوں سے بھر گیا ہے اور مسوڑھے سوُج کر پھٹنے لگے ہیں۔ اس بیماری نے ہردت کو اَدھ مرا سا کر ڈالا اور دو منٹ سے زیادہ دیر کھڑے ہو پانا اُس کے لئے مشکل ہو گیا۔

ایک دن جیل آفیسروں نے قید خانے کا معائنہ کرتے ہوئے، جب اس وقتی انتظار والی لمبی چوڑی کوٹھری میں قدم رکھے، تو قیدیوں نے اپنی اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے ہوئے چارپائیوں کے کھٹمل اور کیڑے دکھائے۔ اس پر ایک آفیسر نے بہت لمبی تقریر کرتے ہوئے ان سے کہا ــــــ "یہ شکایتیں کرنے کی بجائے، تم لوگوں کو چاہیئے کہ دیش کے عظیم ترین رہنما کامریڈ اسٹالن سے اپنی وفاداری کے ثبوت میں، بڑی ایمان داری سے اپنی اپنی سزا بھگتو۔ کسانوں اور مزدوروں کے محافظ کامریڈ اسٹالن کے پانچ سالہ منصوبوں کی کامیابی کے لئے لیبر کیمپوں میں جاکر اس طرح محنت کرو کہ ہم فاشسٹ درندوں کا مقابلہ اچھی طرح سے کر سکیں۔۔"

جب آفیسر چلے گئے اور وقتی انتظار کو پھر تالا لگ گیا تو کئی گھنٹے اس طرح گزرے کہ قیدیوں میں سے باری باری ایک "آفیسر" بن جاتا، اُس تقریر کی نقل اتارتا اور باقی قیدی

تقریر کی داد دیتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہر ہفتے کچھ نئے اس وقتی انتظار والی کوٹھری میں ڈال دیئے جاتے اور کچھ کو لیبر کیمپوں میں بھیج دیا جاتا۔ ڈھائی مہینے بعد ہردت کی بھی باری آ گئی۔ ایک دن قیدیوں کو نکال کر پیدل ریلوے اسٹیشن لے جایا گیا تو چل چل کر نڈھال ہوا ہردت، گاڑی کے ڈبے میں جاکر اس طرح گر پڑا، جیسے وہ موت کے بستر پر گر پڑا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ گاڑی جگہ جگہ رُکتی رہی اور نئے مسافروں کو چڑھاتی رہی، لیکن ہردت کو صرف اتنا ہی ہوش رہا کہ کھڑی ہوئی گاڑی کے چلنے سے جو پہلے دھکے لگتے تھے اُن سے اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بہت دنوں بعد جب قیدیوں کو گاڑی میں سے اُتارا گیا، ہردت نے اُس اسٹیشن کا نام پڑھا ——— "ینژ نی تاگل"

یہ دسمبر کا مہینہ تھا اور صبح کا وقت تھا۔ ہردت نے بدن کو کھینچ کر گاڑی سے نکالا، باہر نکل کر اُسے لگا کہ وہ برف کی کھائی میں گر پڑا ہے۔

قیدیوں کی حاضری لگانے کے بعد انہیں حکم ملا ——— "شاگم مارش۔"

باہر سارے راستے پر برف بچھی ہوئی تھی۔ پتہ لگا کہ لیبر کیمپ وہاں سے کئی میل دور ہے۔ لیکن کچھ قیدیوں نے ہردت سے کہا ——— "اس وقت چلیں گے، تو شاید زندہ رہ جائیں گے ورنہ برف میں یخ ہو جائیں گے۔" ہردت نے چلنے کی کوشش کی مگر دس قدم چل کر گر پڑا، تو بھونکتے ہوئے کتے اُس کی زخمی ٹانگوں کی طرف بڑھے، ساتھ ہی ایک سپاہی کی آواز آئی ——— "اگر تم اُٹھ کر چلو گے نہیں، تو ہمیں تمہیں گولی مار دی جائے گی۔"

ہردت نے پیروں کے بل کھڑا ہونے کی کوشش کی، لیکن پھر گر پڑا۔ تب دو قیدیوں نے اُسے دونوں باہوں سے سہارا دے کر اٹھایا اور اسی طرح کندھوں کا

سہارا دیتے ہوئے اُسے چلانے لگے۔ ہردت کی وجہ سے سبھی کی چال دھیمی پڑگئی تھی۔ اس لئے کئی قیدی اُسے غصّے سے گھورنے لگے زنجیروں والے کُتے بھی اُسے بھونکنے لگے۔ اس پر قیدیوں میں سے ایک نے ہردت سے پوچھا: "ابے ہندوستانی کمیونسٹ! اب مجھے بتا کہ تمہارے باوا مارکس کی اس برف کے دوزخ کے بارے میں کیا تھیوری ہے؟" اُس وقت ہردت مسکرا دیا، کہنے لگا: "یہ کُتے کافی بھونک رہے ہیں۔ اس لئے ان کا کام انہیں پر چھوڑ دو۔"

کیمپ میں پہنچ کر، حاضری لگوانے کے بعد یہ سب قیدی غسل کے لئے پہنچے، تو اچانک ہردت کو لگا کہ اس کے پیر گویا آگ پر رکھے ہوئے ہیں..... اور ہزاروں سوئیاں ایک ساتھ اُس کے پیروں میں چُبھ رہی ہیں۔ اُس کے کراہنے کی آواز سُن کر ایک قیدی نے اس کے پیروں سے پٹھانی چپلیں اُتاریں اور زور زور سے اس کے پیر ملنے لگا۔ خون کی کچھ حرکت اس کے پیروں میں ہوئی تو اُس قیدی نے ہردت کو بتایا کہ ابھی تو دسمبر کا مہینہ ہے، جاڑے کی شروعات۔ یہاں کا روسی جاڑا ابھی تمہیں دیکھنا ہے....."

گرم پانی کے غسل سے ہردت کے بدن کو کچھ سکھ ملا، مگر اُس نے دیکھا کہ بدن کے پھوڑوں کی حالت مزید بگڑ گئی ہے۔ اُسے جب ڈسپنسری میں لے جایا گیا۔ اُس دن کی ڈاکٹر ایک عورت تھی، ایک بھاری سے خوبصورت چہرے والی عورت لیکن اُس کے ہاتھ اور آواز نرم تھی۔ اُس نے ایک نرس سے ہردت کے پھٹے ہوئے بدن پر مرہم لگوا کر ہردت کو ہسپتال بھجوا دیا۔

ہسپتال میں ہردت نے جانا کہ وہ ڈاکٹر عورت، گالینہ سیتپانوونہ پیتروو (GALEENA STEPANORNA PETROVA) ایک نیکدل عورت ہے، ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کی اسسٹنٹ ہے، پہلے ہی خود قیدی ہے اُس کی قید کی وجہ بھی

ہردت کو معلوم ہوئی کہ اُس نے اپنے انقلاب دشمن، خاوند کی مخبری نہیں کی تھی، اس لئے جہاں اُس کے چیف انجینئر خاوند کو پندرہ سال کی سزا دی گئی تھی، وہاں اُسے بھی سزا کی حقدار سمجھا گیا تھا۔

ہردت والے وارڈ کا ڈاکٹر قیدی بھی بہت نیک دل تھا، جس سے ایک دن ہردت نے پیٹ میں اُٹھتے درد کی دوائی مانگی، تو وہ سرد آہ بھر کر کہنے لگا ـــــ "اصل میں یہ بھوک کا درد ہے، اس کی دوائی صرف روٹی ہے۔ جو میں نہیں دے سکتا۔"

روٹی کی کمی کی وجہ سے بہت سے قیدی بیمار تھے اور ہردت نے دیکھا کہ یہ ہسپتال تو قبر کے راستے میں آنے والا ایک پڑاؤ سا ہی لگتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیمار قیدیوں کو ساری سیاسی یا غیر سیاسی بحثیں بھول چکی تھیں اور وہ لذیذ کھانوں کے نام لے کر سارا دن ایک زبانی دعوت سجاتے رہتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہردت جاگتی ہوئی حالت میں اپنا دماغی توازن بنائے رکھنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن جب اُسے نیند آجاتی تو اُس کے سپنے چاولوں کے پلاؤ کی دیگیں اور بھری ہوئی ہانڈیاں اس کے آگے رکھ جاتے تھے۔

کوئی مہینے بھر بعد ایک دن ڈاکٹر گالینہ اور وارڈ کا ڈاکٹر نکولائی ہردت کا معائنہ کرتے ہوئے کتنی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر جانے سے پہلے ڈاکٹر گالینہ نے ہردت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ـــــ "میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گی۔"

کچھ دنوں بعد ڈاکٹر نکولائی نے ہردت سے کہا کہ وہ اس وارڈ کے باورچی خانے کی سونیہ سے ملے۔ سونیہ نے اُسے بتایا کہ وارڈ کے گلیارے میں سے رات کو کوئی بجلی کا بلب اتار کر لے جاتا ہے۔ اگر ہردت رات کو جاگ کر گلیارے کا دھیان رکھے، تو اس کے بدلے میں اُسے کچھ زیادہ روٹی مل جایا کرے گی۔ ۔ ۔

رات کو جاگنا ہوتا تھا، بستر میں سونا نہیں ہوتا تھا، اس لئے ہردت کو ایک روئی دار کوٹ، گھٹنوں تک بوٹ اور کانوں تک سر کو ڈھانپنے والی روئی کی ٹوپی مل گئی۔ یہ کپڑے پہن کر وہ ساری رات لمبے گلیارے میں گھومتا رہتا اور صبح ہوتے ہی یہ کپڑے اتار کر باورچی خانے میں چلا جاتا، جہاں اُسے روٹی کا ایک کافی بڑا ٹکڑا اور گوشت والے شوربے سے بھرا ہوا ایک بڑا پیالہ مل جاتا۔

اگلے کچھ ہفتوں میں، جیسے اُس کی جان لوٹ آئی ہو۔ بدن کے رستے زخم خشک ہو کر بھرنے لگے۔

ہسپتال کے کئی قیدی اُسے بتاتے کہ سونیہ آفیسروں کے ساتھ سوتی ہے، اس لئے اسے الگ کمرہ بھی ملا ہوا ہے اور من مرضی کی روٹی بھی۔ مگر ہردت کو وہ ایک رحمدل قیدی عورت لگتی۔ سونیہ نے کبھی ہردت کو اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ اگر کبھی دوستانہ لہجے میں ہردت کچھ پوچھ بیٹھتا، تو سونیہ ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتی، دھیرے سے کہتی ——— "چپ رہو، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

مارچ کا مہینہ چڑھ آیا تو ہردت بھلے ہی پوری طرح تندرست نہیں ہو پایا تھا۔ اُسے ہسپتال سے خارج کر کے اُس بڑے کمرے میں بھیج دیا گیا جو کمزور قیدیوں کے آرام اور بہتر غذا کے لئے تھا تاکہ وہ پوری طرح تندرست ہو کر کام پر لوٹ سکے اور کام کا حرج نہ ہو۔ کیمپ میں سارا دن لاؤڈ اسپیکر پر ریڈیو کی خبریں سنائی جاتی تھیں کہ کس طرح روسی فوجیں جیت رہی ہیں۔ فاشسٹوں کے ظلموں کی کہانی اتنی بار سنائی جاتی تھی کہ کئی قیدی کھلا کہہ کہتے تھے کہ اگر نازیوں کو کنسنٹریشن کیمپ چلانے نہیں آتے تو کامریڈ اسٹالن سے سیکھ لیں۔

اس کمرے میں کبھی سیاسی بحث بھی ہو جاتی تھی۔ ایک بڑی عمر کا روسی

تھا، جو اس نظام پر لعنتیں دیتے ہوئے ہردت سے کہتا ــــــ "تم ہندوستانی ہو، اس لئے تم میری مخبری نہیں کرو گے۔" اس پر ہردت اُسے کہتا ــــــ "مخبری میں کس لئے کروں گا، مگر میں آپ کے ساتھ متفق نہیں ہوں، کیونکہ آج اسٹالن اچھا لیڈر نہیں ہے۔ تو کل کوئی اچھا لیڈر آجائے گا۔ اس کے علاوہ اسٹالن کے غلط ہونے سے بنیادی اُصول کس طرح غلط ہو گئے؟" اور ہردت کہتا ــــــ جب تک میں جیلوں اور کیمپوں سے باہر جاکر لوگوں کی زندگی کا مطالعہ نہ کرلوں، تب تک میرا تو یہ حق بھی نہیں بنتا کہ میں اسٹالن کو غلط کہوں . . . . . . "

کچھ ہفتوں کے آرام کے بعد ہردت کو ایک بریگیڈ میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا، جہاں اُن سب کو کھیتوں میں کام کرنا ہوتا تھا۔ زیادہ کھیت آلوؤں کے اور بندگوبھی کے تھے اور کچھ گاجر، پیاز اور لال مولی کے۔ یہ کام بھاری نہیں گنا جاتا تھا۔ ہر قیدی کو پانچ گھنٹے کام کرنا ہوتا تھا۔ اور تین گھنٹے آنے جانے میں لگ جاتے تھے۔ ایسی حالت میں کئی کمزور قیدیوں کے لئے یہ کمر توڑ محنت تھی۔ وہاں ایک دن ہردت کام کرتے کرتے بے ہوش سا ہو کر گر پڑا، تو اُس قیدی ٹولے کے قیدی لیڈر نے ہردت کو ٹھوکریں لگا کر اٹھایا اور مکوں سے مارنے لگا۔

دو قیدی سہارا دے کر ہردت کو واپس کیمپ میں لائے، تو اس کے نیلے پیلے ہو گئے چہرے، سوجی ہوئی آنکھیں اور ہونٹوں سے نکلتے خون کو دیکھ کر کیمپ کا قیدی منیم بہت حیران ہوا۔ تب ایک سنتری نے اُسے ساری بات بتائی قیدی منیم نے اس بریگیڈ کے مکھیہ کو بلا کر اُسے بہت پھٹکارا کہ قیدیوں سے کام لینے کا طریقہ ایسا نہیں ہوتا۔ اب یہ چار چھ دن چارپائی پر پڑا رہے گا تو نقصان اس کا نہیں ہوگا بلکہ کام کا نقصان ہوگا اور منیم نے جب ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہردت ہندوستانی ہے، تو مکھیہ نے آکر ہردت سے بہت معافی مانگی۔ اُس

دن ہردت نے ہندوستان کے نام کا جادو بھی دیکھا۔۔۔۔۔۔

ماہ مئی میں موسم بھلے ہی کچھ کھل گیا تھا۔ مگر ہردت کو لگا کہ وہ اگلا جاڑا نہیں کاٹ پائے گا وہ ضرور آنے والے جاڑے میں سردی سے مر جائے گا۔ اُسی دوران اُسے پتہ چلا کہ کچھ قیدی جنوب کی طرف بھیجے جا رہے ہیں۔ قزاختستان کے ژزگزگان علاقے میں جہاں اس قدر سردی نہیں پڑتی تھی۔ لہذا ایک دن ہردت نے قیدی منیم سے گزارش کی کہ اُسے بھی وہاں بھیج دیا جائے قیدی منیم ہنس دیا کہ اگلی سردی میں اُسے مرنے نہیں دیا جائے گا۔ کسی ایسے کام پر لگا دیا جائے گا، جو کیمپ کے اندر ہوگا۔ مگر ۱۹۴۳ء کے ماہ جون کے آخری دن تھے۔ جب ہردت کو ژزگزگان بھیج دیا گیا۔

ہردت اور دیگر پچاس قیدی جب سات دنوں کے مال گاڑی کے سفر کے بعد وہاں پہنچے تو گرم موسم نے ہردت کی ہڈیوں میں کچھ جان ڈال دی۔ یہ کیمپ بالکل ویران جگہ میں تھا۔ میلوں لمبے ریگستانی علاقے میں ایک ادھوری سی عمارت دکھائی دیتی تھی جہاں ایک فیکٹری تعمیر کی جا رہی تھی لیکن جنگ کی وجہ سے کام رُک گیا تھا۔ اصل میں یہ علاقہ تانبے کی کھدائی کے لئے مشہور تھا۔ جہاں ایک انڈسٹری شہر بنایا جانا تھا۔ فی الحال یہ کیمپ ناکارہ شدہ قیدیوں کے لئے بنایا گیا تھا، جو وہاں رہ کر موت کے دن پورے کر سکیں۔

یہاں ریگستانی علاقے میں، نہ اندر سویا جا سکتا تھا نہ باہر۔ اندر چارپائیاں کھٹملوں سے بھری ہوئی تھیں، تو باہر ریگستانی بڑے بڑے بچھو گھومتے تھے۔ ہروقت تھوڑے سے ہفتوں میں اتنا بیمار پڑ گیا کہ اُسے ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔

ہسپتال میں صرف ایک ہی دوائی تھی، اسپرین یا کونین اور ایک ہی اوزار تھا۔ یعنی تھرمامیٹر۔ لیکن اس ہسپتال میں ہردت نے پھر ہندوستان کے نام کا جادو دیکھا

جہاں تیس برس کی قیدی ڈاکٹر صوفیہ مسیح الیونہ ہردت کی آپ بیتی سُن کر اس کی دوست بن گئی۔ وہ ہسپتال کی ڈاکٹر بھی تھی اور دس سال کی سزا بھی بھگت رہی تھی۔

ہردت کو اس ہسپتال میں آئے ایک مہینہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر صوفیہ نے ہردت کو بے انتہا خوشی سے کہا ــــــ "یہاں وہ میڈیکل کمیشن آرہا ہے جو بیمار قیدیوں کا معائنہ کر کے ان میں سے ایسوں کو رہا کر رہا ہے جو کام کرنے کے قابل بالکل نہیں ہے۔" ڈاکٹر صوفیہ نے مزید کہا ــــــ "شکر ہے کہ تم سیاسی قیدی نہیں ہو، تم نے بلا اجازت سوویت سرحد کو پار کیا تھا۔ اس کمیشن کو سیاسی قیدی رہا کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ لیکن مجھے ایک خدشہ سا ہے کہ کیا بدیشی قیدیوں پر یہ رہائی والی بات لاگو ہوتی ہے یا نہیں۔ بہرحال، میں تمہاری رہائی کے لئے سفارش کروں گی......"

اور ٹھیک دس دن بعد ڈاکٹر صوفیہ نے ہردت کو اپنے دفتر کے کمرے میں بُلا کر اُسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا کہ کمیشن نے اُسے محنت مزدوری کے ناقابل سمجھ کر اُس کی رہائی کا حکم دے دیا ہے۔

جس رہائی کے لفظ کو ہردت ناامیدی کے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر کھوجتا تھا، آج جب سچ مچ اُس کی انگلیاں اس لفظ سے چھُو گئیں تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے......

اگلے دن ہردت اور دیگر پچیس قیدی، کیمپ کے سیکورٹی آفس میں بُلائے گئے۔ ہردت کی باری آنے پر آفیسر نے پوچھا ــــــ "تم رہا ہو کر کہاں جانا چاہو گے؟" ہردت نے صفدر کو تلاش کرنا تھا، اس لئے اس کے منہ سے نکلا "ماسکو"، مگر آفیسر نے کہا کہ سزا یافتہ لوگ ماسکو نہیں جا سکتے۔ ساتھ ہی ہردت کی فائیل کے

کاغذ دیکھتے ہوئے آفیسر نے پوچھا ــــ "تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟"

"پاسپورٹ نہیں ہے۔ تھا ہی نہیں" ــــ ہردت نے کہا، تو آفیسر بولا ــــ

"پھر تمہارا کوئی وطن نہیں ہے۔ تمہیں کہاں بھیجا جائے؟"

"کسی گرم علاقے میں" ــــ ہردت کو اب صرف روس کی سردی کا خوف لگ رہا تھا۔

آفیسر کی سیکریٹری لڑکیوں میں سے ایک نے پاس آکر کہا ــــ "اس کو قزاختان کے ایلی شہر میں بھیج دیجئے، وہ کافی گرم جگہ ہے۔" اور اس کی آواز سُن کر دوسری دو لڑکیاں بھی کہنے لگیں ــــ "ہاں، ایلی ٹھیک رہے گا۔"

اب ہردت کے ہاتھ کانپ نہیں رہے تھے، صرف ہونٹوں پہ کانپتی ہوئی ہنسی آگئی کہ اس وقت کئی لڑکیاں مل کر اس کے لئے "گھر" ڈھونڈ رہی ہیں ......

ہردت کو رہ رہ کر یاد آنے والا اس کا وطن اُسے پھر یاد آنے لگا۔ اور خود ہندوستانی ہونے کے فخر کا احساس بھی۔

ہردت کو رہائی کا پروانہ مل گیا، تو ایک آفیسر عورت نے اُس کے سامنے ٹائپ شدہ ایک کاغذ رکھ کر دستخط کرنے کے لئے کہا۔ ہردت نے جب سُننا چاہا کہ کاغذ پر کیا لکھا ہے، تو اُس آفیسر نے بتایا کہ یہ اقرار نامہ ہے کہ وہ باہر جاکر جیلوں اور کیمپوں کی باتیں کسی کو نہیں سُنائے گا اگر سُنائے گا تو اپنی دوبارہ گرفتاری کا ذمہ دار ہوگا۔ ہردت نے اُس کاغذ پر دستخط کر دیئے۔

اُس رات ہردت کو سفر کے دنوں کے لئے روٹی اور اُبلے ہوئے گوشت کے کچھ ٹکڑے باندھ کر دیئے گئے۔

ہردت کے پاس ڈاکٹر صوفیہ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے نہ کوئی لفظ تھا، نہ کوئی چیز تھی۔ سوچ سوچ کر اسے تین سال پہلے کابل میں خریدا ہوا اپنا اوورکوٹ

ہی ایک ایسی چیز دکھائی دی، جسے وہ ڈاکٹر صوفیہ کو دے سکتا تھا اور جسے ڈاکٹر صوفیہ رات کو کمبل کی طرح کام میں لا سکتی تھی۔

اُس نے جب جھجکتے ہوئے صوفیہ کو وہ معمولی سا کوٹ پیش کیا تو صوفیہ نے کہا ——"میں جیل کے اندر ہوں، میرا گزارہ ہو جائے گا۔ لیکن تمہیں جیل سے باہر جانا ہے، باہر اس کوٹ کے بنا تمہارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔" اور کوٹ لوٹاتے ہوئے اُس نے کوٹ کی جیب میں پچاس رُوبل ڈال دیئے، ساتھ ہی کہا —— "تمہیں دیکھ کر لگتا ہے۔ کہ ہندوستان کے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

یہ لمحہ، دو انسانوں کے لئے ہندوستان اور روس کی دو خوبصورت روحوں کو پہچاننے کا لمحہ تھا، اس لئے ہردت کی آنکھوں میں بھی پانی بھر آیا اور ڈاکٹر صوفیہ کی آنکھوں میں بھی ......

۱۶

رہا ہونے والے پچیس قیدی جب اسٹیشن پر پہنچے تو ہردت نے دیکھا کہ ویٹنگ روم اور پلیٹ فارم لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ بہت سے کنبے دو دو تین تین دن سے وہاں گاڑی کے چلنے کے انتظار میں بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ حیران ہوا کہ صرف مردوں اور عورتوں کے چہروں پر، ہی نہیں بلکہ بچوّں کے چہروں پر بھی ایک عجیب سی اُداسی جھلک رہی تھی .....

ان رہا شدہ قیدیوں کی آمد سے لوگوں کی اُداس آنکھوں میں ایک دلچسپی سی جاگ اُٹھی، مگر ہردت پھر حیران ہوا کہ لوگوں کی یہ دلچسپی اُن سے جیل کی خوراک خریدنے کے لئے تھی۔ ہردت نے بڑی خوشی سے جیل سے ملے اُبلے ہوئے بدمزا

گوشت اور نمکین خشک مچھلی کو ان لوگوں کی کالی روٹی سے بدل لیا۔

شام ہو گئی تو ہردت کے ساتھیوں نے درختوں کے کچھ جھاڑ پتے لے کر پلیٹ فارم کے ایک کونے میں آگ جلائی۔ ان کو جیل کی طرف سے لوہے کا ایک ایک کٹورا اور لکڑی کا ایک ایک چمچہ بھی ملا تھا۔ انہوں نے اپنے اسی کٹورے میں کالی روٹی کے کچھ ٹکڑے اُبال کر، نمک ڈال کر کھا لئے۔

اگلے دن گاڑی کے چلنے کی ہلچل ہوئی تو جیل کی طرف سے آئے سنتری اُن رہا شدہ قیدیوں کو گاڑی کی سیٹوں پر بٹھا کر چلے گئے۔

رہائی کے اس پہلے اور نئے احساس نے ہردت میں اس کی بہت دنوں سے دبی ہوئی بھوک اس طرح جگا دی کہ اپنی چھ دنوں کی بندھی ہوئی روٹی اُس نے بے صبر ہو کر دو دنوں میں کھا ڈالی۔

باقی رہا شدہ قیدیوں کا بھی یہی حال تھا۔ اُن میں سے بہت سے ساتھ کے مسافروں سے روٹی مانگنے لگے۔ تو ہردت کو مانگ کر کھانا بہت مشکل لگا اور اُس نے ڈاکٹر صوفیہ کے دیئے ہوئے پچاس روبل نکال کر کچھ مسافروں سے روٹی خرید لی۔

گاڑی کا یہ سفر چھ دن لمبا تھا اور ابھی پورے تین دن باقی تھے۔ بھوک ہردت کو بے حال کئے ہوئے تھی، اس لئے اس نے اپنا اوور کوٹ دے کر ایک اسٹیشن سے دو لیٹر دودھ اور پانچ کلو روٹی خرید لی۔ ....

اِن لوگوں میں سے پندرہ قیدیوں کو ایلی اسٹیشن پر اُترنا تھا اور شہر میں پہنچ کر سب سے پہلے تھانے میں جا کر خبر دینی تھی، جہاں سے اُن کو اندرونی پاسپورٹ یعنی آئیڈنٹی کارڈ ملنا تھا۔ ایسا شخصی شناختی پروانہ روس کے ہر شہری کے لئے لازمی تھا۔ اس پاسپورٹ کے بغیر نہ ہی کسی کو کام مل سکتا تھا اور نہ ہی جائے

رہائش۔

ان قیدیوں میں ہردت واحد شخص تھا جس کے وطن کی تصدیق کے لئے اُس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس لئے اُسے بتایا گیا تھا کہ اسے ایک الگ طرح کا پاسپورٹ ملے گا جو بے وطن لوگوں کو یہاں رہنے کی اجازت کے لئے ملتا ہے اور جسے ہر تین ماہ بعد M.G.B. کے ایک خاص محکمے میں جاکر نیا کروانا ہوتا ہے۔

ہردت جب گاڑی میں سے اُترا، تو شام کے چار بجے تھے وہ اور اُس کے ساتھی سیدھے تھانے چلے گئے، اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے لیکن تھانے کے سامنے لوگوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے پاسپورٹ کو نیا کروانے کے لئے کھڑے تھے۔ وہاں صرف چار آفیسر تھے، جنہیں ساری بھیڑ کو بھگتانا تھا۔ وہاں کھڑے کھڑے شام کے ساڑھے پانچ بج گئے، تو انہوں نے جان لیا کہ آج ان کی باری نہیں آسکتی۔

اب سامنے کچھ روٹی کھانے اور رات کو کہیں سونے کا سوال تھا جس کی تلاش میں وہ سب رہا شدہ قیدی شہر کی گلیوں میں گھومتے ہوئے کئی دروازے کھٹکھٹاتے رہے لیکن اُن کو کوئی ٹھکانہ یا مدد کہیں سے نہیں مل سکی۔ سب نے ہار کر تھانے کے برآمدے میں ہی رات کو پناہ لینے کی سوچی۔ مگر ابھی انہوں نے ٹانگیں پھیلائی ہی تھیں کہ ڈیوٹی آفیسر نے گالیاں بکتے ہوئے انہیں وہاں سے اُٹھا دیا۔

ریلوے اسٹیشن وہاں سے چار کلو میٹر دُور تھا۔ انہوں نے سوچا کہ رات کو وہ ویٹنگ روم کی بینچوں پر سو سکتے ہیں، اس لئے وہ سبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ وہاں ویٹنگ روم کھلا تھا، لہٰذا سبھی بینچوں پر لیٹ گئے۔ ان کی ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ اسٹیشن ماسٹر کی کڑکتی ہوئی آواز نے ان کو جگا دیا اور وہاں سے نکال دیا۔

وہ جب رات کی برفانی ہواؤں باہر کتنی دیر تک اندھیرے میں کھڑے رہے تو ہردت کی چھاتی میں سے مدت سے بھولے بسرے گڈریئے کی ہوک جیسی ایک ہوک اُٹھی "شالا مسافر کوئی نہ دھیوے، اگھ جناں توں بھارے ہوں۔۔۔۔۔۔"

یہ ہوک شاید اسٹیشن ماسٹر نے بھی سُن لی۔ اور سب نے جب دوبارہ اُس کی منت کی تو اُس نے باقی رات کے لئے ان کو ویٹنگ روم میں سو جانے کی اجازت دے دی۔

اگلی صبح وہ سب "آزاد" لوگ پھر سیدھے تھانے میں پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کی دھکے کھاتی ہوئی بھیڑ تھانے کے سامنے جمع ہو چکی ہے۔ ہردت ایک طرف کھڑا ہو گیا کہ ان لوگوں کو شاید کام پر پہنچنا ہوگا۔ اس لئے جلدی چلے جائیں گے جب کہ اُسے کسی کام پر نہیں پہنچنا ہے۔ اس لئے اُسے دھکے کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اکیلا الگ کھڑا تھا، اس لئے قریب کے ایک آدمی نے اُس سے پوچھ لیا —— "تم بھئی، کہاں سے آئے ہو؟" اور جب ہردت نے کہا کہ وہ کیمپ سے رہا ہو کر آیا ہے، ویسے وہ ہندوستانی ہے، تب وہ آدمی مسکرا سا دیا، کہنے لگا —— "ہندوستان سے! میں نے سُنا تھا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اہنسا وادی ہوتے ہیں، تبھی تم بھیڑ میں دھکا مُشتی نہیں کر رہے۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں کہ اگر تمہیں کوئی روزگار تلاش کرنا ہے تو اس شہر میں وہ تمہیں نہیں مل پائے گا۔ یہاں تم بھوکے مر جاؤ گے۔"

ہردت سوچ میں پڑ گیا لیکن کہنے لگا —— "مجھے یہاں رہنے کی اجازت ملی ہے۔ میں کسی دوسرے شہر قصبے میں نہیں جا سکتا۔"

وہ آدمی کہنے لگا —— "تم فکر نہ کرو۔ میں جموں شہر جا رہا ہوں۔ وہاں کئی فیکٹریاں ہیں، تمہیں کام مل جائے گا۔۔۔۔۔۔"

آفیسر کے سامنے جب ہردت کی باری آئی تو اُس نے ہمت بٹور کر کہا ——

"مجھے جموں جانے کا اجازت نامہ دے دیجئے۔ اس شہر میں میرا کوئی واقف نہیں ہے، لیکن

جموں میں ایک دوست رہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آفیسر کا چہرہ غصیلا تھا لیکن جب اُس نے سُنا کہ ہردت ہندوستانی ہے تو اُس کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ فائل کے کاغذوں کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے ایک بار کہا ——

"ہمارے اپنے قیدی کیا کم ہیں جو تم باہر کے ملک والے بھی یہاں قید ہونے کے لئے آجاتے ہو! اور ہمیں مشکل میں ڈال دیتے ہو۔" مگر چند منٹوں بعد سٹیمپ پیڈ کی خشک شدہ سیاہی پر اُس نے تین بار تھوک کر، اسے گیلا کر کے، ہردت کے کاغذ پر مہر لگا دی اور دستخط کر کے ہردت کو جموں جانے کی اجازت دے دی۔

اب دونوں کو راشن کارڈ لینا تھا، روٹی کھانے کے لئے۔ لہذا وہاں کی قطار میں جا کھڑے ہوتے۔ اُس نے دوست نے بتایا کہ اُس کا نام اولف رپاپورٹ ہے، وہ کمیونسٹ ہے، اس لئے اُسے اپنا وطن پولینڈ چھوڑ کر یہاں آنا پڑا ہے۔ جموں میں اُسے کام ملا ہوا ہے اور رہنے کی جگہ بھی ایک نیک دل خاتون کے گھر میں ملی ہوئی ہے۔ وہاں وہ ڈھائی سال سے رہ رہا ہے ۔ ۔ ۔

راشن کارڈ مل جتے تو روٹی کی دکان پر جا کر پتہ لگا کہ شہر کی بیکری کی مرمت ہو رہی ہے، اس عرصہ نہیں ملے گی۔ آٹا ملے گا۔ رپاپورٹ تجربہ کار تھا، اس نے جلدی سے آٹا لے لیا۔ ہردت کو بتایا کہ آٹا بیچ کر دو، ریل کی ٹکٹ بھی خرید لیں گے اور سورج مکھی کے بیجوں سے تیار شدہ کھلی کے ٹکڑے بھی جو عام طور پر جانوروں کو ڈالے جاتے ہیں۔ یہ ٹکڑے سستے بھی ہیں اور طاقت دینے والے بھی۔

"اب چلو، پھر سیدھے اسٹیشن پر" —— جب ہردت نے کہا تو اس کا پولش دوست ہنس دیا اور کہنے لگا —— "اتنی جلدی! ارے دوست، ٹکٹ خریدتے وقت ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھی دکھانا پڑتا ہے کہ ہمیں کوئی چھوت کی بیماری نہیں ہے۔" ہردت کو بھوک بھی لگی ہوتی تھی اور کسی سرے پر پہنچنے کی تمنا بھی، لیکن اُسے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ والی بات بڑی اصول والی لگی۔ وہ دونوں روٹی۔ ٹکی چباتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس گئے

تو ڈاکٹر نے بتایا کہ پہلے اُن کو جا کر پبلک حمام میں غسل لینا پڑے گا۔ وہاں دیکھا جائے گا کہ ان کے کپڑوں میں کھٹمل، پسو، جوں وغیرہ نہیں ہیں اور پھر ایک حمام پروانہ دیا جائے گا۔ اس حمام پروانے کے بعد ڈاکٹر چھوت کی بیماری کا معائنہ کر کے سرٹیفکیٹ دے گا۔

اب وہ دونوں جب پبلک حمام خانہ پہنچے تو پتہ لگا کہ ایندھن کی قلت کی وجہ سے گرم پانی کا غسل خانہ بیس دن کے لئے بند پڑا ہے۔ اب ہردت کو فکر نے آن گھیرا کہ اُس بے در و دیوار کی "آوارہ قید" میں یہ بیس دن کیسے گزریں گے۔ مگر پاپورٹ نے اُسے حوصلہ دیا اور آگے بڑھ کر غسل کر پجاری کی مٹھی میں چند روبل تھما دیئے، جس نے جلدی سے پرچہ لکھ دیا کہ دونوں کے کپڑوں میں کوئی جوں نہیں ہے اور نہ ہی بدن پر کسی بیماری کا نشان۔

آگے ڈاکٹر نے جلدی سے معائنہ کر کے اُن کو صحت مندی کا پرچہ تھما دیا۔ تب ٹکٹ خرید کر وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی جمبول کی راہ پر ہو گئی۔ یہ سات دن کا ریل سفر تھا، بھوک کی وجہ سے اُن کے اندر بل پڑتے رہے۔ لیکن کھلی نے ان کی جان کو بنائے رکھا۔

جمبول پہنچ کر ایک دوسرے کو بازو کا سہارا دے کر چلتے ہوئے وہ شہر پہنچے، تو ایک جگہ اچانک ہردت نے دیکھا کہ اُس کا پولش دوست اس کا بازو چھوڑ کر سامنے سے آ رہی اُس عورت کے پاس جا کھڑا ہوا ہے، جس کے جالی دار تھیلے میں روٹی بھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ہردت کو یہ بھیک والی نوبت اس قدر مشکل لگی کہ وہ تھک کر سڑک کے ایک کنارے بیٹھ گیا۔

"دیکھو، ادھر دیکھو" کی آواز کوئی تین بار آئی، تو ہردت نے دیکھا کہ پاس کے گھر کی ایک عورت کھڑکی میں کھڑی اپنے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلا رہی ہے۔

وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا تو عورت نے کہا ——"میں دیکھ رہی تھی، تمہارا ساتھی تم کو چھوڑ کر کسی سے روٹی مانگنے گیا ہے ..... تمہاری ماں، نہ جانے کہاں تمہاری راہ تکتے رو رہی ہو گی ...... میرا بھی اکلوتا بیٹا جنگی محاذ پر گیا ہوا ہے، نہ جانے اُس کا کیا حال ہے۔ شاید تم سے بھی بڑا ہو ......" اور آنسو پونچھتی ہوئی اُس عورت نے روٹی کا ایک بڑا سا ٹکڑا کھڑکی میں سے ہردت کو پکڑا دیا ......

"ماں، تمہارا مشکور ہوں" —— ہردت نے روٹی پکڑتے ہوئے کہا اور پانی سے بھر آئی آنکھیں جھکا لیں۔

پولش دوست کو خالی ہاتھ لوٹنا پڑا تھا۔ ہردت نے روٹی کا وہ ٹکڑا اُس کے ساتھ بانٹ لیا۔

پولش ساتھی جس نیک عورت کے گھر میں کرایہ دار تھا، اُس نے ہردت کو بھی تہہِ دل سے خوش آمدید کہا اور اپنی رات کی روٹی اور سُوپ اُن کے ساتھ بانٹ لیا۔ اُس عورت کا ایک ہی بیٹا تھا جو جنگ کے محاذ پر تھا۔ باقی چار بیٹیاں تھیں۔ ایک شادی شدہ تھی۔ اور تین کنواریاں جو اپنی ماں کے پاس رہتی تھیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی جوتے بنانے کا کام سیکھتی تھی۔ ایک بڑی بیٹی کسی فیکٹری میں کام کرتی تھی اور دوسری کسی دفتر میں کلرک تھی۔ لڑکیاں چونکہ کام کرتی تھیں، اس لئے اُن کو روزانہ چھ سو گرام روٹی ملتی تھی اور راشن بھی زیادہ ملتا تھا، جب کہ ماں کام نہیں کرتی تھی، اس لئے اُس کو روزانہ چار سو گرام روٹی ملتی تھی اور راشن بھی کم ملتا تھا۔ اگلی صبح ریپاپورٹ تھوڑی سی روٹی اور رات کا بچا ہوا سُوپ پی کر اپنے کام پر چلا گیا۔ ہردت کو سب سے پہلے تھانے میں جاکر اپنی آمد اور جائے رہائش کی اطلاع دینی تھی۔ اُس نیک عورت نے ہردت کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اُس کا پتہ لکھوا دے۔ اور ساتھ ہی کچھ بچی کھچی روٹی بھی کھلا دی۔

تھانے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک جگہ ہردت نے بہت بھیڑ دیکھی تو پتہ لگا کہ جو لوگ رفیوجی بن کر یہاں آتے ہیں، اُن کو اُس جگہ روٹی کے کوپن مل رہے ہیں۔ ہردت یہ سوچ کر قطار میں کھڑا ہو گیا کہ کہیں واپسی تک روٹی کے کوپن اور روٹی ختم نہ ہو جائے۔ گھنٹہ بھر بعد اُس کی باری آئی۔ تو اُس نے آفیسر عورت کو بتایا کہ وہ کل پہلی بار جمیول میں آیا ہے، کام کی تلاش میں۔ ہردت نے جب یہ بتایا کہ وہ ہندوستانی ہے، تو اُس عورت نے اُس کو ساتھ کی کرسی پر بٹھا لیا اور دلاسہ دیتے ہوئے کہنے لگی —

"تم کیسے بُرے وقت میں آئے ہو، جب جنگ نے لوگوں کو بڑی مشکل حالت میں ڈال رکھا ہے۔ میں جتنی بھی تمہاری مدد کر سکتی ہوں کئے دیتی ہوں۔ ہم عام طور پر ایک ہفتے کے راشن کے لئے کوپن دیتے ہیں، مگر میں تم کو دو ہفتوں کے لئے دے دیتی ہوں۔" ساتھ ہی اُس نے یہ بھی کہا کہ اگر ہردت کو پیسوں کی ضرورت ہو تو وہ بھی دے سکتی ہے۔ مگر ہردت کو پیسے مانگتے ہوئے شرم آئی اور اُس نے کہا — "میرے پاس ابھی پیسے ہیں۔"

جب وہ کوپن لے کر جانے لگا تو اُس آفیسر عورت نے پوچھا —

"اب کہاں جاؤ گے؟" ہردت نے جواب میں کہا — "پہلے تھانے میں جا کر رہنے کا ٹھکانہ لکھواؤں گا۔ پھر کوئی کام تلاش کرنے جاؤں گا۔" اس پر اُس عورت نے تھانے میں ٹیلی فون کر کے کسی کو ہردت کی مدد کرنے کے لئے کہہ دیا۔

راستے میں روٹی کی دکان آئی تو ہردت نے سوچا کہ اُس کے لوٹنے تک دُکان بند ہی نہ ہو جائے، اس لئے پانچ کوپن دے کر اُس نے روٹی لے لی۔ یہ دو کلو اور ڈھائی سو گرام روٹی تھی۔ مگر جب وہ روٹی اُٹھا کر چلنے لگا تو دکان والی یہودی عورت نے شور مچا دیا — "پکڑو، پکڑو۔ یہ آدمی دکان میں سے روٹی اُٹھا کر بھاگ رہا ہے۔"

ہردت ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ کوپنوں پر ملنے والی روٹی سرکار کی طرف

سے ملتی ہے۔۔۔۔۔۔اُس نے ساری روٹی پھر دُکان کے کاؤنٹر پر رکھ دی۔ وہ بوڑھی عورت جلدی سے روٹی کو اٹھا کر پرے رکھتی ہوئی، گالیاں بکتی ہوئی بولی ــــ "روٹی کے لئے پیسے مجھے کیا تمہارا باپ دے گا؟"

ہردت کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس کو وہ وقت یاد آیا کہ جب مولانا جھنگے میں روس کی سرحد پار کرتے وقت وہ جھوم کر گا اُٹھا تھا ــــ "رانجھا جوگڑا بن آیا۔۔۔۔۔اس جوگی دی کی وے نشانی، ہتھ وِچ تسبیح اکھ وِچ پانی۔۔۔۔۔" اور اب اُس کے منہ سے اچانک ہی نکلا ــــ "اس جوگی دی کی وے نشانی، کن وِچ گالی، اکھ وِچ پانی۔"

ہردت روٹی کی دُکان سے منہ پھیر کر سوچنے لگا ــــ "اس لوک گیت والے رانجھے کے کان میں بالے تھے اور آنکھ میں پانی تھا۔۔۔۔۔۔لیکن آج کا لوگ گیت کون لکھے گا۔ جب کان کے بالے، گالیاں بن گئے ہیں۔۔۔۔"

۱۷

روٹی کی دکان میں کھڑے ہردت کو، روٹی خریدتی ہوئی کسی عورت نے بتایا تھا۔ کہ اُس جیسے لوگوں کو روٹی کے کوپنوں کے ساتھ پیسے بھی ملتے ہیں اور اُس نے غلطی کی تھی جو کوپن لے لئے لیکن پیسے نہ لئے۔ یہ کہہ کر اُس عورت نے اپنے پاس سے ہردت کو دس روبل دے دیئے، روٹی خریدنے کے لئے۔

تھانے میں بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی مگر وہ حیران ہوا، جب بھیڑ میں سے اُسے کھوج کر کسی نے اُس کا نام پوچھا اور پھر اندر لے جا کر اُس کا نام پتہ درج کیا، اُسے بے وطن لوگوں کو رہنے کی اجازت، والی پرچی دی اور ایک اور پرچی دی جو جمبول ڈسٹری کے ڈائرکٹر کے نام تھی کہ ہردت کو کام دیا جائے۔

وہ جب روٹی لے کر اپنی مکان مالکن کے گھر چھوڑنے گیا تو وہ گھبرا گئی۔ مگر ہردت نے جب اپنے ساتھ بیتی سُنائی تو وہ ہنس دی — "میں ڈر گئی تھی کہ ہائے! تم یہ روٹی کہاں سے چرُا کر لے آئے ....."

ڈسٹلری وہاں سے کئی میل دُور تھی، لیکن ہردت کو کسی بھی طرح کام کھوجنا تھا۔ اس لئے راستے میں دم لے لے کر جب وہ ٹھکانے پر پہنچا، تو شام کے چھ بج گئے تھے۔ ڈائریکٹر نے پرچی پڑھی، ساتھ ہی ہڈیوں کے ڈھانچے جیسے ہردت کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور کھیجھ کر کہنے لگا — "یہ کام تم سے نہیں ہو سکتا۔" مگر اُسی پرچی پر کچھ لکھ کر پرچی ہردت کو واپس کر دی اور کہا — "جاؤ، اوور سیئر کوتسوو (KOTSOV) سے پوچھ لو، اگر اُس کے پاس تمہارے لائق کوئی کام ہو۔"

اب شام اور آگے بڑھ چکی تھی، نہ اوور سیئر سے ملنے کا وقت تھا، نہ لوٹ کر کئی میل چل کر جانے کا۔ مگر ہردت کی ٹانگوں میں، پلک کر دو قدم اٹھانے کی ہمت آگئی جب باہر کے دروازے کے پاس اُس کو کسی نے بتایا کہ وہ سامنے کامریڈ کوتسوو کھڑا ہے۔

کوتسوو بڑے مضبوط ڈیل ڈول کا اور ہنستے چہرے والا آدمی تھا بولا — "تم ہندوستان سے آتے ہو۔ تمہیں ضرور ہمارے ساتھ بے پناہ عشق ہوگا۔ ہمیں مشکور ہونا چاہیئے۔" اور اُس نے اپنے دفتر کی ایک عورت کو بُلا کر کہا — "ناتاشہ! تمہارے بریگیڈ میں کوئی مرد نہیں ہے — لڑکیاں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔ کل سے کامریڈ ہردت تم لوگوں کے ساتھ کام کرے گا۔" ساتھ ہی اُس نے ہردت سے کہا — "صبح ٹھیک نو بجے آجانا۔"

ہردت نے چین کا سانس لیا اور کامریڈ کوتسوو سے پوچھا — "یہاں رات کو رہنے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟" کوتسوو کہنے لگا — "کیوں نہیں، دفتر کے تہہ خانے

میں سو لینا۔"

وہ اندھیرے تہہ خانے میں اُتر گیا، جہاں سونے کے لئے بھُو سا بچھا ہوا تھا۔ اور سرہانے کے لئے کچھ اینٹیں بھی تھیں۔ ہردت نے ٹانگیں پھیلا کر اینٹ کے تکیے پر جب سر رکھا تو اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی ہنسی آگئی ـــــ" وہ بھی وقت تھا جب میں چھوٹا سا دن ہوا کرتا تھا۔ اور گھر کی برساتی والے کمرے کی نواڑ کی چارپائی کو چھوڑ کر فرش پر سوتے وقت سر کے نیچے اینٹ رکھ لیتا تھا تاکہ سر کو اینٹ کے تکیے پر سونے کی عادت ہو جائے......"

تہہ خانے کے اندھیرے میں ہردت کی ایک سوچ بجلی کی طرح کوند گئی کہ یہ کونسی طاقت ہوتی ہے جو آنے والے وقت کے حالات اور حادثوں کا پتہ لگا لیتی ہے...

وہ نیند میں اونگھ رہا تھا، جب تہہ خانے میں اور چھ آدمی آگئے۔ انہوں نے ایک کونے میں آگ جلا کر کچھ پکایا اور کھایا۔ انہوں نے ہردت کو ایک طرف سوتے ہوئے دیکھا، لیکن کہا کچھ نہیں۔ یہ اُسے بعد میں پتہ لگا کہ وہ کبھی اسی فیکٹری میں کام کرتے تھے، لیکن چوری کرنے لگے تھے، جس سے انہیں قید ہو گئی تھی۔ اُس رات وہ قید سے چھوٹ کر آئے تھے اور بڑا نی جگہ پر آکر چوری سے سو گئے تھے۔

صبح ڈسٹلری کے صحن والے چھوٹے سے نلکے میں ہاتھ منہ دھو کر ہردت دفتر کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کل رات کو اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا، مگر بھوک کی وجہ سے اُس کی آنتیں اور بھی کلبلانے لگیں، جب اُس نے دیکھا کہ فیکٹری کے مزدور کینٹین کی طرف جا رہے ہیں۔ اُسے ابھی کینٹین میں جانے والی پرچی نہیں ملی تھی۔ اس لئے وہ حاضری لگوانے کے لئے دفتر کے پاس کھڑا رہا۔ ناتاشہ آئی تو ہنس کر اس سے پوچھنے لگی "تم نے کچھ کھایا ہے؟" ـــــ ہردت نے ہاں میں سر ہلایا تو وہ اور ہنس دی ـــــ "تمہیں تو ابھی پرچی نہیں ملی، تم نے کینٹین میں سے روٹی کیسے

کھائی؟" اور ناتاشہ نے کنٹین میں جا کر، اپنی پرچی پر ملی روٹی اور سوپ بانٹ کر ہردت کے سامنے رکھ دیئے۔

لڑکیوں والے اس بریگیڈ یعنی مزدور ٹولے کا کام، فیکٹری کی مزید تعمیر کے لئے نزدیک کے دریا کے کنارے سے ریت لانا تھا۔ اُن کو ایک ٹھیلا ملا ہوا تھا، ریت ڈھونے کے لئے۔ دریا کے کنارے پر جا کر سب لڑکیوں نے اپنے اپنے بیلچے اُٹھا لئے۔ جب ایک بیلچہ ہردت نے بھی اٹھا لیا تو ناتاشہ جلدی سے کہنے لگی ——— "نہیں نہیں، کامریڈ ہردت! تم سے بیلچہ ٹوٹ جائے گا۔" پھر اُس نے ہنس کر مزید کہا ——— "تم کچھ سوکھی جھاڑیاں چن لاؤ، یہاں آگ جلانے کے لئے۔"

کافی سردی اتر آئی تھی۔ کام بھلے ہی مشقت کا تھا، لیکن ریت ڈھوتے ہوئے سب لڑکیوں کے ہاتھ پاؤں سُن سے ہو جاتے تھے اور انہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہاتھ پاؤں تاپنے پڑتے تھے۔ ہردت گھاس پتے بٹور کر لایا، آگ جلائی اور پھر ہاتھ میں بیلچہ اٹھا لیا ——— "یہ لڑکیاں کام کرتی ہوں اور میں خالی بیٹھ کر آگ تاپتا رہوں۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے؟" اس پر ناتاشہ نے اُس کے ہاتھ سے بیلچہ لیتے ہوئے کہا ——— "دو چار دن آرام کر لو، جسم میں جان پڑ جائے گی تو جتنا جی میں آئے کام کر لینا۔"

جب کچھ دنوں بعد اس رحمدل ناتاشہ کے بارے میں ہردت نے کچھ زیادہ جانا، تو اُس کے من میں اداسی اتر گئی کہ اُس کا خاوند اچانک اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وہ اپنی چھوٹی سی بیٹی کو پالنے کی خاطر یہ محنت مزدوری کرنے کے لئے اکیلی رہ گئی تھی۔۔۔۔۔۔

ہردت کا کام ہلکا تھا۔ لیکن ہفتے بعد کھرے جیسی سردی پڑنے لگی تو اُس کے دانت بجنے لگے۔ اپنے ملک میں اُس نے بجلی کا کام سیکھا ہوا تھا۔ اس لئے اوورسیئر نے اُسے

فیکٹری کے اندر اُس کام پر لگوا دیا۔ اس کام میں زیادہ پولش لوگ تھے۔ جب اُن کو پتہ چلا کہ ہردت ہندوستانی ہے تو کام کے بعد وہ اکثر اُسے گھیر کر بیٹھ جاتے اور پوچھتے کہ کیا اُس نے مہاتما گاندھی کو دیکھا ہے؟ سبھاش چندر بوس جرمنی کیوں چلا گیا؟ وہ ہردت سے مہاتما بدھ، دویکانند، چشتی، ٹیگور اور نہرو کے بارے میں کئی سوال پوچھتے رہتے۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ ہردت رات کو تہہ خانے میں سوتا ہے، تب وہ اُسے اپنے ساتھ مزدوروں کے بورڈنگ ہاؤس میں لے گئے یہ بورڈنگ ہاؤس، لیبر کیمپ کی بیرکوں کی ہو بہو نقل لگتا تھا، لیکن ایک فرق تھا، وہ یہ کہ اس کے غسل خانے میں آئینہ لگا ہوا تھا۔ تین سال بعد ہردت نے آئینہ میں اپنی شکل دیکھی تو دیکھا کہ چھبیس سال کی عمر والے چہرے کی جگہ اُس کے کندھوں پر کسی سوکھے ہوئے، ہڈیوں والے بوڑھے کا چہرہ رکھا ہوا ہے۔.......

بجلی کی مرمّت والے کام میں ہردت کو کئی عمارتوں کی طرف بھی بھاگنا پڑتا تھا اور کھمبوں پہ بھی چڑھنا ہوتا تھا۔ اس لئے فورمین نے سوچا کہ ہردت کو کوئی کم تھکان والا کام ملنا چاہیئے۔ اُس نے اس کو بڑے انجینئر کے پاس بھیجا، جس نے تیوری چڑھا کر کہا یہ سماج دشمن رویّہ ہے۔ یہ کام سے جی چرانا عوام دشمنی ہے۔ بہر حال، اُس کی حالت دیکھ کر خراد کی ٹریننگ کا ایک موقع اُسے دے دیا، جس کے لئے ٹریننگ کے دوران اُسے صرف ایک سو روبل ماہوار ملتے تھے۔ اس سے روز کی خوراک نہیں خریدی جا سکتی تھی۔ مگر بجلی کے محکمے والے اُس کے پولش دوست اسے کینٹین میں اکثر روٹی کھلا دیتے تھے جب کہ وہ بڑی محنت سے کام سیکھتا رہا تاکہ بڑے انجینئر صاحب بہادر کو دکھا سکے کہ وہ محنت سے جی چرانے والا عوام دشمن نہیں ہے۔

خراد کے کام میں پروڈکشن کے حساب سے، چار سو سے لے کر چھ سو روبل تک

ملتے تھے۔ ہردت کی محنت نے اُس کے کام کی پروڈکشن بڑھادی، تو فیکٹری کے نوٹس بورڈ پر اُس کی تعریف میں اس کی فوٹو بھی لگائی گئی تھی۔ اب ہردت کو مہینے کی چار یا پانچ لیٹر ووڈکا بھی فیکٹری کی طرف سے ملنے لگی۔ وہ ووڈکا نہیں پیتا تھا، اس لئے کئی لوگ اُس سے ووڈکا خرید لیتے تھے۔ لیکن پھر بھی اچھی خوراک اُس کے لئے نایاب تھی۔ کیونکہ سرکاری دکانوں میں خریدنے کے لئے کچھ نہیں تھا جب کہ کالے بازار میں ساٹھ روپے کی ایک کلو روٹی ہوگئی تھی، سو روبل کا ایک کلو گوشت اور ڈیڑھ سو روبل میں ایک کلو چینی۔

ہردت کے بدن پر ابھی تک وہی کپڑے تھے جو جیل سے رہائی کے وقت اُس نے پہن رکھے تھے۔ کپڑا صرف کالے بازار سے مل سکتا تھا، اس لئے اُس کی قیمت چکانا پانا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔

۱۹۴۴ء کا ماہ نومبر آگیا، جب اکتوبر انقلاب کی ستائیسویں سالگرہ منائی جانے والی تھی۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ سب مزدوروں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ جشنی میٹنگ میں ضرور شامل ہوں۔ میٹنگ میں لمبی لمبی تقریروں کے بعد جن مزدوروں نے پروڈکشن بڑھایا تھا، اُن کو جب کچھ میٹر کپڑا یا لوبٹ یا چند لیٹر تیل جیسے انعام بانٹے گئے، تو ہردت کو فر کا کالر انعام میں ملا۔ یہ کالر اوورکوٹ پر لگا کر گردن کو گرم رکھنے کے لئے تھا لیکن اُس کے پاس اب کوئی کوٹ نہیں تھا۔ پھر بھی اُس نے ہنس کر اس کالر کو بھلے دنوں کے لئے سنبھال کر رکھ لیا۔ جشنی میٹنگ کے بعد جشنی دعوت ہوئی جس میں سب آفیسر لوگ اور پروڈکشن بڑھانے والے انعام یافتہ مزدور شامل ہوئے۔ لہذا، ہردت کی پونے چار سال کی سوویت زندگی میں وہ پہلا دن تھا جب اُس نے جشن کا لذیذ کھانا چکھ کر دیکھا.......

۱۹۴۵ء چڑھا تو نازیوں کی مکمل شکست کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اب پولینڈ

اور یوکرین اور مغربی روس کے لوگ جو جرمن حملے کی وجہ سے یہاں آگئے تھے، وہ واپس جانے لگے۔ پولینڈ کے مزدوروں نے کام کے ماحول کو خوشگوار بنا رکھا تھا۔ وہ چلے گئے تو بورڈنگ ہاؤس میں رہن سہن بھی کافی گھٹیا ہوگیا اور وہاں چوری جیسی وارداتیں بھی آئے دن ہونے لگیں۔ لہٰذا ہردت نے اب اپنے رہنے کے لئے باہر کوئی جگہ کھوجنی چاہی۔ کھوج کھوج میں اسے ایک بیوہ عورت کے کچے گھر میں پناہ مل گئی۔ جہاں وہ عورت اور اس کی بیٹی نیورا رہتی تھیں۔ صرف نیورا NEWRA کام کرتی تھی اور چھ سو گرام روٹی لے آیا کرتی تھی۔ اس لئے وہ دونوں بہت خوش ہوئیں کہ ہردت کے آنے سے گھر کا راشن بڑھ جائے گا۔

اس کچے گھر کی رسوئی، گھر کی سب سے خوشنما جگہ تھی، جہاں بنی ہوئی گھر کی ساگ بھاجی کھا کر ہردت کی صحت میں کچھ فرق پڑنے لگا۔ اب اُس کی تنخواہ میں سے بھی کچھ پیسے بچنے لگے تھے، جس سے اُس نے ایک پرانی قمیص پینٹ بھی خرید لی اور ایک پرانا بوٹ بھی۔

کچے گھروں کی بستی سے فیکٹری میں جانے کا اور فیکٹری سے بستی میں لوٹ کر آنے کا ایک ٹائم ٹیبل سا بن گیا تھا، لیکن ہردت کا اندرونی اکیلاپن کبھی کبھی اُسے پریشان اور بے کس و بے بس کر دیتا اور وہ اُداس ہو کر سوچتا کہ اُس نے پرانے کپڑے تو کھوج لئے لیکن اپنا پرانا دوست کہیں نہیں کھوج پایا ......

صوفیہ اور ناتاشہ جیسی نیک دل عورتیں اُس نے ضرور دیکھی تھیں، لیکن صفدر جیسے دوست کے لئے وہ کبھی کبھی ترس جاتا تھا۔ ہردت جانتا تھا کہ وہ پولیس کی نگرانی میں ہے، اس لئے کام سے متعلقہ بات کے علاوہ وہ کسی سے دعا سلام کرنے سے بھی ہچکچاتا تھا، لیکن ایک دن اُسے خوشی بھی ہوئی اور حیرانی بھی، جب پلاننگ سیکشن کے ایک آفیسر الیوان گریگوری ویچ لیئو چینکو

(IVAN GRIGORIVICH LEVCHENKO) نے بڑی ہمدردی سے دعا سلام کیا اور ہردت سے ہند و فلاسفی کے بارے میں کئی باتیں پوچھتا رہا۔

وہ گریگوری وِچ یوکرین کا رہنے والا تھا۔ زار کی فوج میں آفیسر تھا، جب پہلی جنگِ عظیم کے دوران اُس کی ایک ٹانگ، گھٹنوں سے کٹ گئی تھی۔ اکتوبر انقلاب کے بعد اُسے پکڑ کر سائبریا بھیج دیا گیا تھا، جہاں سے لوٹ کر اب وہ ماسکو نہیں جا سکتا تھا۔ جہاں اس کی بیٹی رہتی تھی۔ اس کی بیوی وفات پا چکی تھی اور اکلوتا بیٹا لاپتہ ہو چکا تھا۔ یہ گریگوری وِچ کی تنہائی تھی جس سے ہردت کو اپنا پن محسوس ہونے لگا تھا۔

وہاں ایک حادثہ سا ہو گیا، جب فیکٹری کی ٹریڈ یونین کمیٹی کی صدر، ایک جوان اور خوبصورت عورت ساشہ سکلے رینکو ہردت پر اچانک مہربان ہو گئی۔ ہردت نے سُن رکھا تھا کہ وہ ساشہ فیکٹری کی چرائی ہوئی ووڈکا کو کالے بازار میں بیچ کر خوب روبل کماتی ہے، اس لیے وہ ساشہ کی مہربانی سے گھبرا گیا۔

ایک دن ساشہ نے کہا ہردت بہت بڑھیا مزدور ہے، اس لیے اُسے پارٹی کے سٹڈی سرکل میں داخل ہو جانا چاہیئے اور اُس کی سفارش وہ کر دے گی۔ سٹڈی سرکل کی بیٹھک ہر وبر وار کو ہوا کرتی تھی۔ یہ بات جب ہردت نے گریگوری وِچ کو بتائی تو وہ ہنس کر کہنے لگا ـــــــ "تمہیں ضرور جانا چاہیئے، یہ تمہاری ترقی کا راستہ ہے"۔ ہردت نے ایک ہی بار جا کر دیکھ لیا کہ سطحی سی بات چیت کے سوا، وہاں کچھ نہیں ہوتا، تو ہردت بیٹھک میں جانے سے گریز کرنے لگا۔

اس پر ساشہ نے اپنے بیٹے کو انگریزی پڑھانے کے لئے ہردت سے کہا۔ مگر جب وہ ساشہ کے گھر گیا، اُس نے ساشہ کے جال کو سُونگھ لیا اور اپنے لئے دعوت جیسی سجائی ہوئی میز کا شکریہ ادا کر کے لوٹ آیا۔

ہردت نے اپنے کندھے سے لپٹے ہوتے ساشہ کے بازو کو بھلے ہی بڑی

شائستگی کے ساتھ پرے ہٹایا تھا، مگر کچھ دنوں بعد اُس نے دیکھا کہ ساشہ کی ناراضگی اُسے بڑی مشکلوں کی طرف دھکیل رہی ہے، شاید کسی کالے اندھیرے کی طرف......

۱۸

اندھیرے کے گھر آئے بادلوں میں سے ایک دن اچانک ایک شعاع پھوٹ پڑی۔ ہردت اپنے دھیان میں فیکٹری کی طرف چلا جا رہا تھا کہ ایک گلی میں ایک سُرخ کرن جیسی جوان لڑکی اُس کے سامنے آکھڑی ہوئی کہنے لگی —— "کامریڈ ہردت! میرا خیال ہے کہ تم رہنے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈ رہے ہو۔"

"ویسے تو جہاں رہتا ہوں، ٹھیک ہے، پھر بھی تلاش کر رہا ہوں ——" ہردت نے کہا، تو وہ لڑکی کہنے لگی —— "میرا باپ گھوڑوں کے اصطبل میں سائیس ہے، ہفتے میں ایک بار گھر میں آتا ہے چھٹی والے دن۔ باقی چھ دن میں اور میری ماں اکیلی ہوتی ہیں۔ اس لئے ہمارے گھر میں تمہارے لئے کھُلی جگہ ہوگی ......"

ہردت ہنس سا دیا —— "تم نے کھُلی جگہ کی بات تو بتائی! لیکن یہ بتایا ہی نہیں کہ گھر کس جگہ ہے؟ تم نے اپنا نام بھی نہیں بتایا......"

وہ کرن ذرا سا شرما کر ہنس دی —— "تم آنکھ اُٹھا کر دیکھو تو تم کو پتہ لگے .... گھر اسی گلی میں ہے، جہاں تم رہتے ہو۔ میرا نام تانہ ہے' ناتالیہ مارکووینہ لاریونووا۔ اتوار کو آکر گھر بھی دیکھ لینا اور میرے ماں باپ سے بھی مل لینا۔"

"اچھا"، کہہ کر ہردت کام پر چلا گیا، مگر یہ بات اُسے یاد نہیں تھی جب اگلے

اتوار کو اُس نے اتوار بازار میں سے کچھ مرچ مسالہ، پیاز اور سستی مچھلی خریدی۔ مگر مکان مالکن کے رسوئی کمرے میں بیٹھ کر جب پکانے لگا تو دیکھا کہ چولہا جلانے کے لئے ایندھن نہیں تھا۔ اُس وقت اُسے خیال آیا کہ نا تہ کا گھر نزدیک ہے، شاید اُن کے گھر میں ایندھن ہوگا اور ساتھ ہی خیال آیا کہ اُس نے اتوار کو اپنے گھر بُلایا تھا......

نا تہ کی ماں بھی نا تہ کی طرح خوبصورت، بھوری آنکھوں والی اور خوش مزاج عورت تھی۔ اُس نے ہردت کو چائے پلائی اور ہندوستان کی باتیں کرتی ہوئی اُس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی رہی۔ اپنا دکھ بھی کہتی رہی کہ اُس کا ایک بیٹا تھا، لیکن جنگ میں مارا گیا.....

نا تہ کا باپ جب گھر میں آیا، وہ بھی ہردت سے تپاک سے ملا بتاتا رہا کہ وہ کلاق ہے، بہت آزاد طبیعت۔ اُس نے بتایا کہ کلاق بہت جگر والے ہوتے ہیں، اصلی زمیندار۔ اس لئے انقلاب کے وقت وہ اپنی زمین نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، لیکن سرکار نے زبردستی زمین چھین لی اور انہیں گھر سے بے گھر کر دیا۔ وہ امیروں کی گنتی میں آتے تھے، اس لئے انقلابیوں نے بہتوں کو قتل کر دیا مگر کچھ تھوڑے سے تھے جو مارے مارے پھرتے ہوئے بچ گئے.....

مذہبی اور سیاسی اعتقادات کی باتیں کرتے ہوئے، ہردت کئی جگہ نا تہ کے باپ کے خیالات سے متفق نہیں ہوا، پھر بھی اُس نے پہلی بار کسی کے گھر میں اپنے آپ کو گھر کا آدمی سا محسوس کیا۔ اُسے نا تہ اور اُس کے ماں باپ اچھے لوگ تھے۔

ہردت نے اپنی رہائش نہیں بدلی، لیکن اُس کا کام کے بعد کا وقت نا تہ سے متعلقہ خیالوں سے بھرا رہنے لگا۔ نا تہ دن بھر لوگوں کے کپڑوں کی مرمت اور سلائی کرتے ہوتے شام کے وقت کا انتظار کرنے لگی، جب ہردت کے آنے پر

وہ گٹار بجائے گی اور لوک گیت گاتے گی۔۔۔۔۔۔

اس دوستی کے دھاگے دونوں کے دلوں سے لپٹنے لگے تھے کہ ایک دوپہر فیکٹری کے ورکشاپ مینجر نے اُسے بُلا کر ایک کاغذ پر دستخط کرنے کے لئے کہا۔ یہ لسٹ سرکاری قرضہ بانڈ سے تعلق رکھتی تھی۔ جب کہ سرکاری قرضہ بانڈ لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق خریدنے ہوتے تھے۔ ہردت نے جب ایک ہزار روبل رقم کے سامنے اپنا نام بھرا ہوا دیکھا تو گھبرا کر کہنے لگا۔

"میں اتنی بڑی رقم نہیں دے پاؤں گا۔"

مینجر نے اُس کے ساتھیوں کے ناموں کے آگے بھی بڑی رقمیں لکھی ہوئی دکھائیں اور کہا کہ یہ رقم اکٹھی نہیں دینی ہوگی بلکہ ہر ماہ تنخواہ میں سے کٹوتی کر کے پوری کر لی جائے گی۔

پوری تنخواہ سے جس طرح کی روٹی نصیب ہوتی تھی، ہردت جانتا تھا۔ اس لئے کہنے لگا۔۔۔ "تنخواہ میں سے بھی کٹوتی ہوگی تو کھاؤں گا کیا؟"

مینجر نے میز پر زور سے مُکّا مارا اور گرجا۔۔۔ "اچھا تو تمہیں اس ملک کی خوشحالی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ تم انقلاب دشمن ہو۔"

اور ہردت نے سر جھکا کر مرضی کے مطابق، کاغذ پر دستخط کر دیئے۔

یہ ایک نئی اُداسی گھر آئی تھی، اس لئے ناتہ نے اس اُداسی کو بانٹتے ہوئے ہردت سے کہا کہ اُس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہے گی۔

اُس وقت ہردت اٹھائیس برس کا تھا اور ناتہ چھبیس برس کی اور دونوں نے بھرپور جوانی کے دریا میں اپنے اپنے گزرے وقت کی اُداسیاں بہا دیں۔۔۔

یہ برس ۱۹۴۶ء کا تھا۔ ماہ فروری کی چھبیس تاریخ شادی کے لئے پکّی ہو گئی تو ناتہ نے باہوں میں سارا جادو لپیٹ کر وہ باہیں ہردت کے گلے میں ڈال دیں۔

"دیکھو! میرے پتا کا من رکھ لو۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ تم عیسائی ہو جاؤ......"

ہردت اپنے حال پر زور سے ہنسنے لگا، تو ناتہ گھبرا گئی۔ ہردت نے کہا——

"پیاری ناتہ! میں زندگی پر ہنس رہا ہوں کہ اس نے مجھے کتنے رنگ دکھائے ہیں؟ میں نے ایک ہندو برہمن گھر میں جنم لیا۔ جوان ہوا تو کمیونسٹ بن گیا۔ پھر برطانوی سرکار سے چھپنا پڑا، تو مسلمان بن کر روزانہ پانچ نمازیں پڑھتا رہا۔ اور اب جسے پیار کیا ہے، اس کا باپ چاہتا ہے کہ عیسائی بن جاؤں......"

۲۶ تاریخ کی آدھی رات تھی، جب ایک پادری نے آکر شادی کی رسم پوری کردی، اور دونوں کو ایک دوسرے کی روشنی میں چھوڑ کر خود جس طرح اندھیرے سے آیا تھا، اندھیرے میں واپس چلا گیا۔

رہنے کے خیال سے ہردت نے پہلی بار ناتہ کے گھر کو دیکھا، تو پوچھا——

"لیکن ہم سوئیں گے کہاں؟"

اس ایک کمرے والے گھر میں جہاں روٹی پکائی جاتی تھی، سبھی وہیں پر سوتے تھے۔ اس لئے ناتہ نے کہا—— "جہاں سب لوگ سوتے ہیں اور کہاں؟"

اس وقت ہردت نے جانا کہ اس ساری بستی میں سب لوگ اسی طرح رہتے ہیں، جیتے ہیں اور اس لئے ناتہ اس کے دل کی حالت کی گہرائی نہیں پا سکتی۔

اور اس رات ہردت کے کہنے پر ناتہ نے بھوسے والی کوٹھری کو دھو کر اپنی اور ہردت کی ٹنگنوں والی چارپائی بچھا دی......

۹ مئی کو پارٹی کی ضلع کمیٹی نے جب اچھے کام کے سلسلہ میں کچھ مزدوروں کو اعزاز نامے دیئے، تو ہردت کو بھی ایک اعزاز نامہ ملا اور ساتھ ہی کوٹ کا گرم کپڑا بھی۔ مگر چند ہفتوں بعد جب وہ رات بارہ بجے کی شفٹ پر کام کرنے گیا، تو اس سے پہلی شفٹ کے فرادیتے فورمین شمتکو نے اسے بلایا۔ شمتکو گھبرایا ہوا الگ

رہا تھا۔ کہنے لگا کہ پارٹی کی ضلع کمیٹی نے تھوڑی دیر ہوئی، ایک آرڈر بھیجا ہے، اڑتالیس ڈک بولٹ بنانے کا۔ یہ صبح اُن تک پہنچ جانے چاہئیں — "لیکن کس طرح؟" — ہر دت نے کہا، اور بتایا — "تم جانتے ہو کہ اس کام کے لئے ٹولنہ ہولڈر ضروری ہے جب کہ تمہارا کہنا ہے کہ یہ خرادی پرزہ ٹوٹ گیا ہے۔ آج رات کی شفٹ والا کاریگر بھی نہیں کہ اُس کی مرمت ہو سکے۔"

ہر دت نے اُس ادھ مرے ٹولنہ ہولڈر میں جوں توں کر کے کٹنگ ٹول کس لیا، جو بار بار ڈھیلا پڑ جاتا تھا اور بڑی مشکل اور پریشانی سے اُس نے آٹھ گھنٹوں میں اٹھارہ ڈک بولٹ بنا ہی لئے۔ مگر صبح وہ جواب دہ تھا۔ کہ پورے اڑتالیس کیوں نہیں تیار ہوتے۔

'کیوں'، کا جواب سارے آفیسر جانتے تھے، لیکن اُن کا 'کیوں' سے ساتھ واسطہ نہیں تھا۔ 'کیوں'، کا واسطہ صرف ٹوٹے ہوتے ٹولنہ ہولڈر سے تھا، اور وہ مُنہ سے بول نہیں سکتا تھا۔

اُس وقت ہر دت کو لگا کہ وہ بھی ایک 'ٹوٹے ہوتے ٹولنہ ہولڈر کی طرح ہے'، جو کبھی مُنہ سے بول نہیں پائے گا۔

اس طرح مُنہ بند کئے ہر دت کے کچھ دن گزر گئے، لیکن ایک شام جب وہ کام سے لوٹا، اُس کی بیوی نانہ کی ایک سہیلی آئی ہوئی تھی جو نانہ کے پاس بیٹھ کر رو رہی تھی۔ ہر دت جانتا تھا کہ نانہ کی وہ سہیلی پاس کے گاؤں میں رہتی ہے، جہاں وہ لوگ کھیتی باڑی پر گزارہ کرتے ہیں۔ اُس نے بتایا کہ اُس گاؤں کے لوگ بھلے ہی مویشی نہیں رکھ سکتے۔ لیکن سرکاری قانون کے مطابق انہیں ضرور رکھنے چاہئیں اور ٹیکس کے طور پر سو کلو دُودھ پندرہ کلو گھی اور کچھ گوشت دینا چاہیئے۔ مثلاً بہت سے کنبے مل کر ایک بیل خرید لیتے ہیں اور اُسے مار کر اُس کا گوشت بطور ٹیکس دے

دیتے ہیں مگر اس سال عجیب مشکل آکھڑی ہوتی ہے وہ یہ کہ پہلے کی طرح انہوں نے اس سال بھی آلو بوتے تھے جو وہ سرکاری قیمت پر سرکار کو دے دیتے تھے مگر اس سال سرکاری انسپکٹر گندم مانگتا ہے، کہتا ہے کہ اس سال آلوؤں کی بجائے گندم لینے کا قانون بن گیا ہے ..... نانہ کی سہیلی نے ڈر سے کانپتے ہوئے مزید کہا ——
"اب ہم گندم کہاں سے لائیں؟ ہم لوگوں نے بہت کہا کہ اگلے سال ہم آلو نہیں بوئیں گے گندم بوئیں گے۔ لیکن ہماری کوئی نہیں سنتا۔ اب وہ ہماری زمین ضبط کر لیں گے۔ اور ہمیں لیبر کیمپ میں ڈال دیں گے......"

ہردت نے لینن کے نظریات کا لفظ لفظ پڑھ رکھا تھا۔ اُس کے فلسفے کی رُوح کو پہچانتا تھا۔ اس لئے اپنے دوست گریگوری وچ کے پاس جا کر جب ایسی حالتوں پر کچھ غصّے سے بولنے لگا، تو گریگوری وچ ہنس دیا۔ کہنے لگا —— "تم بہت بولنے لگے ہو ہردت! تمہارا کیا بنے گا......"

یہ جمبول شہر میں چناؤ کے دن تھے۔ ایک دن گھر لوٹتے ہوئے ہردت نے دیکھا کہ ایک بوڑھے قزاخ نے بہت شراب پی رکھی تھی، اتنی زیادہ کہ اُس سے چلا نہیں جا رہا تھا اور دو نوجوان لڑکے اُسے گالیاں بکتے ہوئے گھسیٹ رہے تھے۔ ہردت سے رہا نہیں گیا اور اُس نے دونوں نوجوانوں سے کہا۔

"اس کی عمر کا لحاظ کرو۔ بے چارے کو گھسیٹ کیوں رہے ہو؟" اس پر وہ آگ بگولا ہو کر کہنے لگے —— "چناؤ والے وارڈ میں کھڑے ہمیں رات ہونے لگی ہے۔ یہی ایک بوڑھا رہ گیا ہے جو ووٹ ڈالنے نہیں گیا۔ کل ہم جواب دہ ہوں گے کہ ایک ووٹ کس طرح کم ہو گیا......"

ہردت زبان کو دانتوں تلے دبا کر اپنی راہ چل دیا۔ مگر اس کا یہ راستہ اب اپنی بیوی نانہ کے پاس پہنچ کر ایک دیوار کے سامنے رُک جاتا تھا۔ یہ ایک نئی

دیوار بھی جو اُس کے اور ناتہ کے پیروں کے آگئے، دن بدن اونچی ہونے لگی تھی۔ ناتہ کے باپ کو امید تھی کہ اس کا داماد گھر کی گاتے چرا کر لائے گا۔ گھر کے پچھواڑے والی زمین میں کھاد ڈال کر کوئی ساگ بھاجی بھی اُگائے گا اور ایندھن کے لئے اُپلے بھی تھاپے گا۔ مگر غراد کے کام سے تھکا ہوا ہردت جب آکر کوئی اخبار یا کتاب پڑھنے لگتا تو روز کے طعنوں کی دیوار پر کسی نہ کسی گالی سے طنز کی نئی اینٹ رکھ دی جاتی اور دیوار مزید اونچی ہو جاتی......

ناتہ اپنے باپ کے رویّے سے خوش نہیں تھی۔ لیکن اُس کے آگے بول نہیں سکتی تھی۔ اس لئے چُپ اور اداس، ہردت کے بازو سے لگ کر سو جاتی تھی.....

گھر کی اُٹھتی ہوئی یہ دیوار ایک دن سر سے اُونچی اُٹھ گئی، جب فیکٹری کے مزدوروں اور عملے کو تھوڑی تھوڑی زمین بانٹی گئی، سبزی بھاجی اُگانے کے لئے۔ یہ بٹوارہ اُس ساشہ سکلے رینکو کو کرنا تھا، جس کی مہربانی، کو ایک دن ہردت نے قبول نہیں کیا تھا۔ لہذا، ہردت جانتا تھا کہ اس بٹوارے میں اُس کا حصّہ نہیں ہوگا۔ جب یہی ہوا تو ناتہ کے باپ کی نظروں میں ہردت بالکل نکمّا اور حرام خور ہوگیا...

ناتہ نے رو کر جب ساشہ سکلے رینکو سے ملنے کے لئے ہردت سے کہا تو وہ مجبور پیروں سے ساشہ کے پاس چلا گیا۔ ہردت کا بُجھا ہوا چہرہ دیکھ کر ساشہ کا چہرہ چمک اُٹھا اور زہریلی خوبصورت ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے اُس نے کہا — "کامریڈ ہردت! آپ نے ایک امیر باپ کی بیٹی سے شادی کی ہے۔ آپ کو کیا ضرورت ہے زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کی۔......" ہردت جان گیا کہ اُس کے مستقبل کی جھولی میں آگ کی کوئی چنگاری پڑ گئی ہے۔

یہ ۱۹۴۷ء کے ستمبر کا مہینہ تھا۔

ہردت کو ہر تین ماہ بعد تھانے میں جا کر بے وطن آدمی کے پاسپورٹ، پر

مہر لگوانی ہوتی تھی۔ مگر اس بار جب وہ مہر لگوانے کے لئے تھانے کے باہر کھڑا تھا، تو اُس نے ایک اخبار میں پڑھا کہ ۱۵ اگست کے دن ہندوستان آزاد ہو گیا تھا........

خوشی کی تھرتھراہٹ ہردت کے ماتھے میں سے گزرتی ہوئی اُس کے ہاتھوں کی انگلیوں میں آئی جہاں اُس نے اپنے بے وطن ہونے کا پاسپورٹ پکڑا ہوا تھا.......

ہردت نے ایک بار پاسپورٹ کی طرف دیکھا، پھر ایک بار تھانے کی طرف۔ اور اُسے لگا کہ جیسے پٹھانی علاقے کے لوگوں نے چراغ جلانے کے لئے ایک سفید مُلّا کو مار کر قبر بنالی تھی، ویسے ہی وقت نے بھی اُسے ایک قبر میں اس لئے دفنا دیا ہے کہ اُس کی قبر پر اُس کے وطن کی آزادی کا چراغ جلا سکے......

۱۹

جمبول ڈسٹرکٹ کے کرتا دھرتاؤں کی طرف سے، جب سبھی مزدوروں کو بھی ضروریات کی خاطر ساگ بھاجی بونے کے لئے زمین مل گئی، لیکن ہردت کو نہ ملی، تب مزدور حق کے لئے دی گئی عرضیوں کے حشر کی نوبت یہاں تک آ گئی کہ ہردت کو کام سے استعفیٰ دینا پڑا۔

چُلک تاؤ نامی قصبہ جمبول شہر سے کوئی نوّے کلومیٹر کی دُوری پر تھا۔ جہاں کھاد کے کارخانے میں مزدوروں کی ضرورت تھی۔ ہردت نے سوچا کہ بھلے ہی اُس کو جمبول سے باہر جانے کی قانونی اجازت نہیں ہے، لیکن چُلک تاؤ قصبہ جمبول کے ضلع میں ہے، اس لئے اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مگر اُس نے جب اپنی بیوی نانہ سے

کہا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ چلے، تو ناتہ نے خدشے بھرے لہجے میں کہا —— "میرا یہاں سے دُور جانا میرے باپ کو اچھا نہیں لگے گا۔"

ہردت نے اپنے اکیلے رہ گئے پیروں کی طرف دیکھا، پھر سنبھل کر کہنے لگا —— "اچھا، کام کا بھی ابھی کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ میں کام کھوج کر رہنے کی کوئی جگہ بنا لوں، پھر تمہیں لے جاؤں گا......" مگر جب جاتے وقت اُس نے ناتہ کو باہوں میں بھر کر گلے سے لگایا، تو اُسے لگا کہ وہ ناتہ کے دیئے ہوئے سُکھوں کو آخری بار گلے سے لگا کر دیکھ رہا ہے......

مُلک تاؤ میں پہنچ کر دو دن کے بعد اُسے کھاد کے کارخانے کی ایک ورکشاپ میں کام مل گیا، جہاں پہلی بار اُس نے بہت بڑھیا اوزار دیکھے۔ پتہ لگا کہ کسی جنگی معاہدے کے مطابق یہ مشینیں جرمنی سے آتی تھیں۔ کئی مشینیں لاپروائی کی وجہ سے قدرے زنگ کھا گئی تھیں، تو پھر ہردت کے کاریگر ہاتھوں نے جب انہیں چھُوا تو مشینوں کے اندر ایک دوست سے ہاتھ ملانے جیسا تپاک جاگ اُٹھا۔

یہاں کا رہن سہن خراب تھا۔ مزدوروں کے بورڈنگ ہاؤس کی حالت اصطبل سے بھی گئی گزری تھی۔ نم خوردہ دنوں کے بعد کبھی دھوپ چڑھتی تو فراخ عورتیں باہر زمین پر بیٹھ کر ایک دوسری کی جوئیں نکالنے لگتیں۔ رات پڑتے ہی مرد گھر کی بنائی ہوئی ووڈکا پی کر مدہوش ہو جانا چاہتے۔ کالی روٹی کے سوا کچھ ملنا مشکل تھا، اس لئے غذائی پریشانی تھی۔ صرف ایک غنیمت ہوئی کہ کارخانے کے ایک بجلی مزدور نے ہردت کے سونے کے لئے اپنے گھر کے کمرے میں ایک چارپائی ڈلوادی۔

یہاں ہردت کو پہلے سے زیادہ اُجرت ملتی تھی، اس لئے اُس کے دل میں آیا کہ اگر ناتہ پاس ہو، تو کنٹین کی گھٹیا خوراک کی بجائے وہ گھر میں کچھ بڑھیا کھانا بنا سکتے ہیں۔

وہ کچھ دنوں بعد جمبول جاکر نانہ ۔۔ مل آتا تھا، لیکن نانہ کے باپ ہردتیہ ہر بار اُس کے پیروں کو سوچ پیر ڈال دیتا تھا۔ ایک بار جب اُس نے ہمت بڑ کر نانہ کو اپنے دل کی بات بتائی تو رنگاکہ اُس کی بات وہیں زمین پر اُس کے پیروں کے پاس گر پڑی ہے۔۔۔

اس کارخانے میں کتنے ہی جاپانی، جنگی قیدی کام کرتے تھے۔ رات کو انہیں جیل میں رکھا جاتا تھا اور دن کو کام پر لایا جاتا تھا۔ اُن کے ساتھ باقی مزدوروں کو بات کرنے کی مناہی تھی۔ ہردت صرف یہ جانتا تھا کہ وہ جاپانی جنگی قیدی اپنے جس جاپانی آفیسر کے تحت کام کرتے تھے، وہ انگریزی ... اُس کا نام یامہ موٹو تھا۔ ایک دن جب فورمین وہاں نہیں تھا، وہ یامہ موٹو کام ... نے سے ہردت والی مشین کے پاس آکر کھڑا ہوا اور اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "نمستے"، بتایا کہ وہ بُدھ کی جنم بھومی سے آئے ہردت کے ساتھ لمبی دنوں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسی نے ہردت کو بتایا کہ سبھاش چندر بوس کی ایک ہوائی حادثے میں موت ہو گئی ہے۔۔۔

روزانہ چند منٹ کی ملاقات ہونے لگی تو دونوں کو دوستی کا احساس ہونے لگا۔ اسی دوران ایک دن یامہ موٹو نے کہا کہ اُس کی انٹرپریٹر اورنگا محسا کو وہ ہردت سے ملنا چاہتی ہے۔

اورنگا کا گھر جیل کے پاس ہی تھا، جہاں اُس کے بلانے پر ہردت شام کو ملنے گیا، تو اورنگا نے بتایا کہ اُس نے ماسکو کی اورنٹیل سٹڈیز کی انسٹی ٹیوٹ میں جاپانی سیکھی تھی اور اس کی ایشیائی ملکوں میں بڑی دلچسپی ہے۔۔۔۔۔۔

اورنگا اور ہردت چائے پیتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے لیکن جب اورنگا نے محسوس کیا کہ ہردت کو روسی کے علاوہ انگریزی، اُردو، ہندی اور پنجابی بھی آتی ہے اور کچھ فارسی بھی، تو اُس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ کہنے لگی ــــ "پھر میں نے ٹھیک ہی سوچا تھا کہ تم خراد کے کام میں یوں ہی وقت گنوا رہے ہو۔ ہمارے ملک

کو یہ زبانیں جاننے والوں کی بڑی ضرورت ہے۔ تم کو اورنیٹل سٹڈیز انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنا چاہیئے۔ میں ابھی تمہاری طرف سے عرضی لکھتی ہوں اور ڈائریکٹر کو بھیج دیتی ہوں......"

ہردت کو کوئی امید تو نہیں تھی، پھر بھی دوسرے دن اولگا نے اُس کی طرف سے عرضی لکھ دی تو ہردت نے دستخط کر دیئے......

ہفتے گزر گئے، تو ہردت کو لگا کہ اولگا کو اپنے ملک کی ضروریات کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اُسے اپنی چھاتی میں کوئی خواب نہیں پالنا چاہیئے۔ مگر اُس کی چھاتی میں اُس کے سانس دھڑکنے لگے جب لگ بھگ ایک ماہ بعد اچانک ڈائریکٹر کا خط آگیا کہ وہ انٹرویو دینے کے لئے ماسکو میں آجائے۔

آٹھ برس بعد وہ گھڑی آئی تھی، سپنوں سے بھری ہوئی، جو ہردت نے ۱۹۴۱ء میں سوویت زمین پر پاؤں رکھتے وقت دیکھی تھی۔

ٹُلک تاؤ میں آئے تین مہینے نہیں ہوئے تھے، اس لئے ماسکو جانے کی اجازت ابھی یہاں سے نہیں مل سکتی تھی، وہ جمبول رجسٹریشن آفس سے ہی مل سکتی تھی۔ وہاں جانے میں، اجازت لینے میں، پھر ماسکو جا کر لوٹنے میں اُسے کئی ہفتے لگ جاتے، اس لئے کام سے استعفیٰ دینے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ ورکشاپ کے سُپروائزر نے ہردت کو ہمدردانہ لہجے میں بہت سمجھایا کہ اس ورکشاپ جیسا کام اُس کو کبھی نہیں ملے گا، مگر ہردت نے خمار بھری آواز میں ہردت کو سمجھایا کہ آگے سے کبھی اس طرح کے کاموں کی اُسے ضرورت ہی نہیں پڑے گی، "پروفیسر" بن جانے کی خبر نے ناتہ کو بھی خوش اور اُس کے باپ کو بھی خوش کر دیا۔

رجسٹریشن دفتر نے اس کی درخواست لے لی اور بتایا کہ کچھ دنوں بعد اجازت ملنے پر اس کو اطلاع دی جائے گی۔ ہفتہ گزر گیا، کوئی اطلاع نہ آئی۔ ہردت پھر پتہ

کرنے گیا تو کہا گیا کہ چند دن بعد اطلاع مل جائے گی۔

اس طرح ایک مہینہ گزرنے کو آگیا تو ایک آفیسر نے بتایا کہ یہ اجازت جس خاص سیاہی سے لکھی ہوتی ہے، وہ ایک خاص جگہ میں خاص حفاظت سے رکھی جاتی ہے۔ اور اُس کی چابی جس آفیسر کے پاس ہے، وہ دورے پر گیا ہوا ہے۔ اُس کے آنے میں ایک ہفتہ لگ جائے گا۔

ہفتے کے بعد کہا گیا کہ آفیسر ابھی نہیں آیا ہے اور نہ ہی اُس کے آنے کی کوئی اطلاع آئی ہے۔

"پھر کیا کروں؟ اگر میں نے انٹرویو کے لئے جانے میں اتنی دیر کر دی تو مجھے شاید کام نہیں ملے گا.......،" ہردت نے فکر کا اظہار کیا۔ اس پر آفیسر نے کہا — "دیکھو، تحریری اجازت محض ایک خانہ پری ہوتی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ اوّل تو تم کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی اور اگر ماسکو میں پولیس نے تم سے کچھ پوچھا بھی، تو بتا دینا کہ تم نے، ہم سے زبانی اجازت لی ہوئی ہے۔ آخر یہ اجازت میں دے رہا ہوں......"

اب ہردت کے سامنے ماسکو جانے کے لئے ریل ٹکٹ خریدنے کا سوال آیا جس کے لئے اُس کے پاس پوری رقم نہیں تھی۔ تب ناتہ نے شوگر فیکٹری میں کام کرنے والی اپنی ایک سہیلی سے چھ کلوگرام چینی اس شرط پر لے لی کہ اس کے بدلے میں وہ اُس سہیلی کے کپڑے مفت میں سی دیا کرے گی۔ اب وہ چینی بیچ کر ناتہ نے ہردت کے لئے ٹکٹ خرید لی۔ اس رقم میں بکنگ کلرک کی رشوت بھی شامل تھی۔

ہردت نے لکڑی کے بکس میں کپڑے ڈالے، اُسے تالا لگایا اور جیب میں ڈالی ہوئی ماسکو کی ٹکٹ کو اپنے پرپنکھوں کی طرح سہلاتے ہوئے جب اسٹیشن پر جاکر گاڑی میں پاؤں رکھنے لگا، تو ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اُسے گاڑی میں

چڑھنے سے روک لیا۔ بتایا کہ ریلوے پولیس اُس کا سامان دیکھے گی۔ . . . . .

لکڑی کے اس چھوٹے سے بکس کی تلاشی ختم ہی ہونے میں نہیں آ پا رہی تھی کہ گاڑی کے چلنے کی آواز آنے لگی۔ ہردت نے گھبرا کر پولیس والوں کی طرف دیکھا، تو وہ اب بھی بڑے اطمینان کے ساتھ بکس کی نس نس کو ٹٹول رہے تھے۔

گاڑی جب چلی گئی تو پولیس آفیسر کو اچانک پتہ چل گیا کہ ہردت کے پاسپورٹ پر تو ماسکو جانے کی اجازت والی مہر ہی نہیں لگی ہوئی! ہردت نے بتایا کہ اُس نے زبانی اجازت دے رکھی ہے، ساتھ ہی وہ خط دکھایا جس میں انسٹی ٹیوٹ کا بلاوا تھا۔ مگر آفیسر نے اُس سے ٹکٹ لے کر کہا ــــ "یہ ٹکٹ، تم کو واپس مل جائے گی تم اسی ٹکٹ پر جا سکو گے، لیکن پہلے پاسپورٹ پر اجازت کی مہر لگوانی ہوئی۔ اگر اجازت نہ ملی تو یہ ٹکٹ ضبط کر لی جائے گی کہ تم غیر قانونی طور پر جھول سے باہر جا رہے تھے۔"

جس ٹکٹ سے ہردت کو اپنے جسم پر پنکھ لگ گئے محسوس ہوئے تھے، وہ پولیس آفیسر نے چھین کر اپنی جیب میں ڈال لی، تب ہردت پاؤں کو گھسیٹتا ہوا سا اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

وہ شہر کے تھانہ آفیسر کے پاس گیا، جس نے زبانی اجازت دی تھی، لیکن جس طرح اُس نے زبانی اجازت دی تھی، اُسی طرح زبانی غلطی تسلیم کر لی۔

اور اجازت لکھنے والی وہ خاص سیاہی، جو ایک بڑی محفوظ جگہ پر پڑی ہوئی تھی، کبھی بھی غیر محفوظ جگہ پر نہیں آئی . . . . . .

۲۰

ہردت نے اپنے خیالوں کے بکھرے ٹکڑوں کو ایک بار پھر سے جوڑا اور گا سے

اُس نے سُنا تھا کہ تاشقند یونیورسٹی میں بھی ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں بھی ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو یہ زبانیں پڑھا سکیں۔ اُس نے سوچا کہ جیل یافتہ لوگوں کو ماسکو میں جانے کی مناہی ہے لیکن تاشقند ایک ری پبلک اُزبکستان کی راجدھانی ہے۔ لہٰذا اُس نے ہمت باندھ کر سنٹرل ایشین سٹیٹ یونیورسٹی، تاشقند کو ایک عرضی لکھ بھیجی کہ وہاں وہ اردو زبان بخوبی پڑھا سکے گا۔

وہ جانتا تھا کہ عرضی کا جواب آنے میں کئی ہفتے لگ جائیں گے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُسے اب لوٹ کر چلک تاؤ میں چھوڑی ہوئی نوکری نہیں ملے گی۔ اس لئے وہ کوئی چھوٹی موٹی عارضی نوکری کی تلاش میں تھا۔ اسی دوران ایک دن ناتہ کے باپ نے، اخبار پڑھتے ہوئے ہردت کے ہاتھ سے اخبار چھپٹ کر کہا ——

"تمہیں خدا کی مار، اٹھاؤ اپنا بوریہ بستر اور نکل جاؤ میرے گھر سے۔ تم نکھٹو حرام خور ناتسک کہاں سے میری بیٹی کے پلے پڑ گئے۔ . . . . . "

ناتہ اور اُس کی ماں رونے لگیں لیکن وہ ناتہ کے باپ کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی تھیں۔ لہٰذا، جس بھوسے والی کوٹھری کو دھو پونچھ کر ہردت نے اپنا کمرا بنایا ہوا تھا، اُس میں سے اپنی گٹھڑی پوٹلی اٹھا کر وہ گھر سے چلا گیا۔ سُورج ڈوب چکا تھا، شہر میں کہیں ٹھکانا نہیں تھا اس لئے اُس نے گریگوری وِچ کے پاس جا کر دو راتوں کے لئے پناہ مانگی اور اگلے دن ریلوے مزدوروں کے دفتر میں بھرتی ہونے چلا گیا۔

سوویت یونین میں ریل محکمہ فوجی محکمے کی طرح کام کرتا تھا، اس لئے ریلوے آفیسروں کے عہدے بھی فوجی عہدوں جیسے ہوتے ہیں۔ وہاں ریلوے مینجر نے ہردت سے کہا کہ ریل پٹڑیوں کی مرمت والے کام میں اُسے عام مزدوری ملے گی یعنی تین سو یا کام کے مطابق چار سو روبل، اس لئے خرادجتنی اُجرت نہیں مل پائے گی۔ مگر جس

وقت ہردت نے کہا کہ اُسے کام چاہیئے، بھلے ہی جھاڑو لگانے کا کام مِل جائے تو مینجر نے اُسی وقت اُسے مزدور بھرتی کر لیا۔

ریلوے لائن کے نزدیک ایک کوٹھری لے کر، ہردت کانپتے ہوئے پیروں سے ایک بار پھر ناتہ سے ملنے گیا —— "میری جان! صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آؤ، آج بیوی خاوند کے رشتے کو دوستی میں بدل لیں۔ میرے پاس تمہارے لئے کوئی اچھا مستقبل نہیں ہے۔ ہماری مذہبی رسم کی شادی یہاں کے قانون کی نظر میں شادی نہیں ہے، اس لئے قانون کو طلاق نامے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم عمر بھر ایک دوسرے کے دوست رہیں گے......"

ناتہ نے جب ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو رہے ہیں، تو ماں نے اُٹھ کر ہردت کو گلے سے لگا لیا ——
"تم میرے بیٹے جیسے ہو۔ میں نہیں جانتی کہ قانون کو کیا چاہیئے اور کیا نہیں چاہیئے۔ لیکن تمہارے دن پھر جائیں تو لوٹ آنا......"

ناتہ نے بھی اقرار مانگا —— "کبھی ملنے تو آیا کرو گے نا!"

اور ہردت نے صرف اس نازک سے اقرار کو اپنی روح میں سنبھال کر رشتوں کی ساری گانٹھوں کو کھول دیا......

ریل پٹڑیوں کی مرمّت کا کام کمر توڑ تھا۔ لیکن ہردت کو کوئی گلہ شکوہ نہیں تھا۔ وہ بہت حیران ہوا، جب چند ہفتوں بعد مینجر نے اُسے لوہار خانے میں بھیج دیا۔ جہاں لوہار کو چھ سو روبل ماہوار ملتے تھے اور عام مزدوروں کو دو سو روبل۔ ہردت فکرمند ہوا تو مینجر نے کہا —— "تمہیں سادھارن مزدور کی تنخواہ نہیں ملے گی، تمہیں ایک خرادیئے کی تنخواہ ملے گی یعنی پانچ سو روبل۔"

اُس لوہار خانے میں ہردت نے کچھ ہفتے گزارے تھے کہ ایک دن مینجر نے

اُسے بلاکر کہا کہ شہر سوویت عمارت یعنی پنچایتی عمارت میں ابھی چلے جاؤ، کیونکہ اُس سے ملنے کے لئے کوئی انتظار کر رہا ہے۔ وہاں جاکر ہردت کو معلوم ہوا کہ تاشقند یونیورسٹی والوں نے اُسے انٹرویو کے لئے جو خط بھیجا تھا، وہ اُسے نہیں ملا تھا۔ اور اب سربری کو ونام کا ایک پروفیسر خاص طور پر پتہ کرنے آیا ہے کہ ہردت تاشقند یونیورسٹی میں کام کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔

ایک بار پھر وہی گھڑی آگئی تھی جب ہردت کی رگوں میں خون کی حرکت تیز ہو گئی......

وہ کبھی کبھی ناتہ سے ملنے جاتا تھا۔ ناتہ خوش ہوتی تھی لیکن ایک دن ماں نے بتایا کہ اُس کے آنے سے، ناتہ کا باپ اُن کے کئی دن بڑے مشکل بنا دیتا ہے.... تب ہردت نے اپنی تمنائیں طلاس دریا کے کناروں کو سونپ دیں......

اسی دریا کے کنارے ایک شام وہ جانے لگا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ریلوے ڈسپنسری کی آنیہ کتائیوا (ANYA KATAEVA) بڑی منت سے ریلوے انجن کے ڈرائیور سے کوئلہ مانگ رہی ہے اور آنیہ کو گالیاں بکتے ہوئے وہ ڈانٹ رہا ہے۔ ہردت جانتا تھا کہ وہ ڈرائیور ہر روز اپنے لئے کتنا کوئلہ چراتا ہے۔ ہردت نے غم و غصہ سے منہ پھیر لیا۔ اُس کے تن بدن میں گویا آگ لگ گئی۔ دریا کی طرف لے جانے والے اُس کے پاؤں سوچ میں پڑ گئے اور چار قدم چل کر پیچھے بڑے لوہار کامریڈ سچ (SICH) کے گھر کی طرف لوٹ پڑے، جس سے لوہار خانے کی چابی مانگ کر، اُس نے کوئلے کی ایک بالٹی بھر لی اور ڈسپنسری میں جاکر آنیہ کو دے دیا۔

مکڑی سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ریلوے ڈسپنسری بھی تھی اور آنیہ کا گھر بھی۔ ایک دن ہردت جب سر درد کے لئے اسپرین لینے گیا تھا تو آنیہ کچھ غصے

سے بولی ——"میں جانتی تھی کہ تمہیں سردرد ہو جائے گا۔ تم ہر روز ننگے سر دریا پر جاتے ہو۔ میں ہر روز تمہیں جاتے ہوئے کھڑکی میں سے دیکھتی ہوں۔ تم سر پر کوئی ٹوپی پہن کر کیوں نہیں جاتے؟ کوئی مفلر ہی سر پر لپیٹ لیا کرو۔"

ہردت نے ہنس کر کہا —— "پھر تم میرے سردرد کا انتظار کیوں کرتی رہیں؟ تم نے کھڑکی میں بیٹھ کر، وہاں سے آواز دے کر کیوں نہیں کہہ دیا تھا کہ میں سر کو ڈھانپنے کی عادت اپنا لوں؟"

اُس دن آئینہ نے ہردت کو چولہے کے پاس بٹھا کر چائے پلائی اور کتنے ہی گھنٹے بیٹھنے کے بعد جب ہردت لوٹا تو اُسے لگا کہ اُس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کتنا اکیلا تھا...... کتنا اکیلا......

آئینہ کی زندگی ملک کی ہزاروں عورتوں جیسی تھی کہ جب جنگ کے دنوں میں وہ فوجی نرس بن کر چلی گئی تھی، تو اُس کے لوٹنے تک اُس کے ماں باپ نہیں رہے تھے۔ اُس کے فوجی خاوند کو کسی اور عورت سے محبت ہو گئی تھی اور اُس نے آئینہ کو طلاق دے دی تھی......

یہ آئینہ، ناتہ سے کہیں زیادہ سمجھدار اور سنجیدہ عورت تھی جس کا جسم نازک اور ریشمی تھا لیکن اندر سے وہ لوہے کے تار جیسی مضبوط تھی۔ وہ محبت کی خاطر مرنا بھی جانتی تھی۔ اس آئینہ کی محبت میں ہردت نے پہچانا کہ بالغ محبت کی دیوانگی کیا ہوتی ہے......

لیکن ان خُمار بھرے دنوں پر ایک حادثہ باز کی طرح جھپٹ پڑا۔ جب ایک شام ہردت نے دیکھا کہ انیس نمبر ریلوے یونٹ کا ایک بڑا افسر آفیسر آئینہ کی کیبن میں بیٹھا ہوا اُٹھنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ ہردت اُلٹے پاؤں وہاں سے لوٹ آیا۔ پوری دو شامیں دریا کے کنارے ایک پتھر کی طرح بیٹھا رہا۔ تیسری صبح

لوہار خانے میں آکر آنیہ نے پتھر سے ہو گئے ہردت سے کہا ــــ "تمہیں غصہ کرنے کا حق نہیں بنتا۔ وہ آدمی پانچ بچوں کا باپ ہے، لیکن میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں اُسے ڈسپنسری میں سے جانے کے لئے نہیں کہہ سکتی، اس لئے میں رہنے کے لئے کوئی الگ کوٹھڑی ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہاں آنے کے لئے اُس کے پاس کوئی بہانہ نہیں ہوگا......"

ایک ہفتہ بعد آنیہ نے رہنے کے لئے الگ کوٹھڑی کھوج لی، لیکن چار دن بعد اُس آفیسر نے ہردت کو بُلا کر کہا کہ اس ریلوے یونٹ کے پاس خراد نہیں ہے، اس لئے فائینینس ڈپارٹمنٹ نے اعتراض کیا ہے کہ اسے خرادیئے کی تنخواہ کیوں دی جاتی ہے۔ لہذا، آگے سے اس کو ایک سادھارن مزدور کی دوسو رُوبل تنخواہ ملے گی۔

ہردت نے تاؤ کھا کر جواب دیا ــــ "کیا اتنے دن یہ فائینینس والے انتظار کرتے رہے کہ کب آنیہ رہنے کے لئے الگ کوٹھڑی لے گی اور میری تنخواہ گھٹائی جائے گی؟"

"زبان بند کرو!" آفیسر نے کڑک کر کہا ــــ "یہ برطانیہ کی پارلیمنٹ نہیں ہے، جہاں کوئی بھی بکواس کی جاسکتی ہے۔"

"میں دوسو روبل پہ کام نہیں کروں گا ــــ" ہردت نے کہا، تو آفیسر نے ایک کاغذ سامنے رکھ دیا، یہ بات لکھ کر دینے کے لئے۔

ہردت نے کاغذ پر دستخط کر دیئے اور بے روزگار ہو کر لوٹتے ہوئے آنیہ کے پاس آکر کہنے لگا ــــ "M.G.B والے اب مجھے گرفتار کر لیں گے۔" آنیہ کو اُس کا خدشہ بے بنیاد دکھائی دیا، وہ کہنے لگی ــــ "کچھ نہیں ہوگا۔ تم کسی اور جگہ کام کھوج لینا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی، تمہارے پاس۔"

طلاس ضلع کے ایک گاؤں میں ٹریکٹروں کا اسٹیشن تھا، جہاں ہردت کو کام مل سکتا تھا۔ کیونکہ وہاں پانچ ہزار تھے، مگر وہ دوسرا ضلع تھا۔ جس کے لئے جمبول سے باہر جانے کی پولیس سے اجازت لینی تھی۔ وہ اجازت لینے جب ہردت گیا تو پولیس آفیسر ہنس دیا، کہنے لگا ——

"میں تمہیں تاشقند جانے کی اجازت لکھ دیتا ہوں۔ وہاں اگر یونیورسٹی نے تمہیں نوکری دے دی، تو وہاں رہنے کی اجازت بھی مل جائے گی۔"

ہردت حیران ہوا کہ پولیس کو اس کے تاشقند جانے والے خواب، کا علم کس طرح ہوگیا۔ مگر یہ پیش کش اس کی امید سے بہت بڑی تھی، اس لئے ہردت دوسرے دن ہی تاشقند چلا گیا۔

اس نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی، اس لئے یونیورسٹی پہنچ کر جب اس نے ڈین سے ملنا چاہا تو اسے حیرانی نہیں ہوئی جب اسے بتایا گیا کہ ڈین پارٹی میٹنگ میں ہے، آج ملاقات نہیں ہو سکتی۔

مگر اسے حیرانی ہوئی جب اس کا نام پتہ سن کر اسے بیٹھنے کے لئے کہا گیا، اور بتایا گیا کہ ڈین اس کا انتظار کر رہا تھا۔

ڈین کی ملاقات اس کے لئے تپاک سے بھری ہوئی تھی۔ ڈین نے کچھ منٹوں کی بات چیت کے بعد ہردت کو نوکری کی تحریری منظوری دے دی، جو اس کی اب ایسی دستاویز تھی، جسے ہردت نے جمبول واپس جا کر پولیس تھانے میں دکھانا تھا اور پکے طور پر تاشقند میں رہنے کی اجازت لکھوانی تھی۔

ہردت کے لئے رات کو رہنے کا بندوبست ڈین نے اپنے دفتر میں کر دیا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے لئے جب وہ تاشقند کے بازاروں میں گیا تو ایشیائی ملوں نے اس کی روح کو سرسبز و شاداب سا کر دیا۔ اس نے کچھ نان اور کباب کھائے

پھر دیکھا کہ وہاں بازاروں میں کپڑے دھونے کا صابن اور سوتی کپڑے بھی بک رہے ہیں۔ یہ نظارہ جمبول کے لوگوں کے لئے ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ لہٰذا اُس نے جلدی سے کچھ صابن کی ٹکیاں اور تین قمیضوں کا پھولدار کپڑا خرید لیا۔ ایک آئینہ کے لئے ایک ناتہ کے لئے اور ایک ناتہ کی ماں کے لئے.....

دوسرے دن اُڑتے ہوئے پیروں سے ہردت جمبول لوٹا۔ سب سے پہلے آئینہ کے پاس جا کر اُس نے اپنی نوکری کی خوشخبری سنائی اور پھر تھانے میں جاکر نوکری کی تحریری منظوری اُن کی میز پر رکھ دی۔ آفیسر ہنس دیا ــــ "کامریڈ ہردت! اب تم تاشقند جانے کے لئے آزاد ہو۔ اب وہاں رہنے کی منظوری تاشقند رجسٹریشن دفتر سے ملے گی۔"

یہ رات آئینہ اور ہردت کی "سوتی جاگتی رات تھی، جس کا مستقبل اقراروں سے بھرا ہوا تھا کہ ہردت کو تاشقند جاکر جب رہنے کے لئے جگہ مل جائے گی تو آئینہ اس ریلوے ڈسپنسری کے کام سے استعفیٰ دے کر اُس کے پاس تاشقند آجائے گی۔

اگلے دن ہردت نے الوداعی ملاقات میں ناتہ کو بھی قمیض کا تحفہ دیا اور ناتہ کی ماں کو بھی۔

یہ ۱۹۴۸ء کا ماہ فروری تھا، دُھند سے اور آئینہ کی یادوں سے بھرا ہوا لیکن اپریل کے آفتابی دن مزید آفتابی ہو اُٹھے جب، وہ آئینہ کو لینے کے لئے اسٹیشن پر گیا۔

انہوں نے سوچا تھا کہ آئینہ کی تاشقند میں آمد کی اطلاع تھانے میں دے کر وہ کورٹ میں جلدی ہی شادی کر لیں گے، لیکن اس خواب نے انہیں صرف بہلا سا دیا۔ جب، پولیس تھانے والوں نے کہا کہ تاشقند میں رہنے کے لئے جس خاص اجازت کی ضرورت ہوتی ہے، اُسے ملنے میں کئی ماہ لگ جائیں گے۔

آئینہ، فی الحال تاشقند میں نہیں رہ سکتی تھی، اس لئے تاشقند سے باہر کوئی

سو کلو میٹر دور ایک قصبے میں اسسٹنٹ ڈاکٹر کی نوکری کھوج لی، جہاں سے وہ چھٹی والے دن ہردت سے ملنے آسکتی تھی۔ پولیس والوں نے بتایا کہ آئینہ کو ستمبر تک تاشقند میں رہنے کی اجازت مل جائے گی۔

ماہ اپریل کے تیسرے ہفتے کا سوموار تھا، جس کی پہلی شام والا آئینہ کا ملن، ہردت کے انگوں میں ابھی خمار کی طرح بسا ہوا تھا کہ ڈین نے اُسے اپنے کمرے میں بُلا بھیجا۔ ہردت نے غور نہیں کیا کہ ڈین کا چہرہ کچھ اُترا ہوا تھا۔ اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈین سے ہاتھ ملایا اور ڈین کہنے لگا ــــ " کامریڈ ہردت! یونیورسٹی آپ کو کچھ دنوں کے لئے 'جمبول' بھیجنا چاہتی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ چین کے سِن سیانگ علاقے کے کئی اِغور جمبول آکر بسے ہوئے ہیں۔ یونیورسٹی میں جو طلبا اِغور زبان سیکھ رہے ہیں، ہم کچھ مہینوں کے لئے ان کو جمبول بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ اُن کا تلفظ درست ہو جائے۔ آپ جمبول میں تین چار سال رہ چکے ہیں، اس لئے طلبا کے رہنے اور کھانے کا بندوبست کرنے کے لئے آپ کو ہی بھیجنا مناسب ہے...!"

"کب جانا ہوگا؟" جب ہردت نے پوچھا، تو ڈین نے ریل ٹکٹ، اُس کے سامنے رکھ دیا۔ ساتھ ہی اُوپر کے خرچے کے لئے نو سو رُوبل بھی۔

اور کہا ــــ "شام کی گاڑی سے۔"

شام کی گاڑی پکڑنی تھی اور اس دوران آئینہ کو خبر دینے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

اس لئے ہردت اداس ہوا، لیکن اُس نے رات کے آٹھ بجے والی گاڑی پکڑ لی۔

اگلی دوپہر جب، جمبول کا اسٹیشن نزدیک آگیا، تو کنڈکٹر نے گاڑی کے ڈبے میں ہردت کے پاس آکر کہا کہ اُس کی کیبن میں اُس سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔ ہردت کنڈکٹر کے ساتھ جب اس کی کیبن میں گیا، تو دیکھا کہ ملنے کی خواہش رکھنے والا ایک مسافر تھا، جو اُس کے ساتھ ہی تاشقند سے گاڑی میں چڑھا تھا۔

"مسافر نے جیب میں سے M.G.B کا لال کارڈ نکال کر ہردت کو دکھایا اور کہا۔
"پاسپورٹ میرے حوالے کر دو۔ تمہیں جمبول اسٹیشن پر اترنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم یہاں سے سیدھے عالم اتا جا رہے ہیں۔"

ساتھ ہی مسافر نے جیب میں سے پستول نکال کر کہا کہ وہ گاڑی میں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ اس ڈبے میں آدھے سے زیادہ مسافر، ہم M.G.B کے آدمی ہیں۔

جمبول کا اسٹیشن جس طرح آیا تھا اسی طرح گزر گیا۔ اس مسافر نے اس کے کھانے کے لئے ڈائننگ روم میں کھانا منگوایا لیکن ہردت کے گلے سے نوالہ نہیں اتر سکا۔

اگلی صبح عالم آتا کا اسٹیشن آیا، قزاخستان کی راجدھانی کا، جس کے پلیٹ فارم پر M.G.B کے کئی ہتھیار بند گارڈز اس کے انتظار میں تھے۔

ہردت کے گرد ایک گھیرا ڈال کر، اسے گاڑی میں سے اتار کر، جب باہر جیپ میں اسے دھکیلا گیا، تو آفیسروں نے اس کے دائیں بائیں اور پیچھے بیٹھتے ہوئے اپنے اپنے پستول نکال لئے ......

۲۱

آئینہ!

یہ ایک ایسا لفظ تھا جو ہردت کے ہونٹوں سے لے کر اس کے کانوں تک پھیل گیا اور اس کا زمین و آسمان اس میں گھر کر رہ گیا .....

اسے پوری طرح ہوش نہیں تھا کہ کس وقت وہ جیپ M.G.B کے عالم اتا ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئی تھی۔ اور کس وقت ایک کمرے میں بند کر کے اس

کے کپڑے اُتروا کر، اس کے انگ انگ کی تلاشی لی گئی تھی۔ کِس وقت، اُسے ایک کوٹھری میں ڈال کر، کوٹھری کو تالا لگا دیا گیا تھا۔

ایک ہی سوچ اُس کے ماتھے میں ہیجان برپا کرتی رہی کہ آئینہ کا کیا ہوگا؟ وہ بہت غصے والی ہے۔ وہ جب ہردت کو بے گناہ کہے گی تو اُس کا حشر بھی یہی ہوگا ...... کیا وہ بھی اس وقت جیل کی کسی کوٹھری میں ہوگی؟ ......

دو ہفتوں سے کوٹھری میں بند ہردت کو جب ایک آفیسر کے سامنے پیش کیا گیا، تو آفیسر نے پستول نکال کر میز پہ رکھتے ہوئے اُسے کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور چند لمحے بعد کہنے لگا ——— "ہردت، تمہاری گرفتاری سوویت کونٹر انٹیلی جنس سروس کی طرف سے ہوئی ہے جو دنیا کی سب سے بڑھیا انٹیلی جنس سروس ہے۔ لیکن اگر تم اکتوبر انقلاب کے خلاف جاسوسی کا اپنا جرم قبول کر لو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔"

آفیسر کی آواز کچھ نرم پڑ گئی جب اُس نے کہا ——— "مجھے تم جیسے غریب احمقوں کے ساتھ ہمدردی ہے کہ تم لوگ سونے کی چمک دیکھ کر مغرب کے جاسوس بن جاتے ہو۔ اگر تم اپنے آپ جرم قبول کر لو، تو میں تمہاری جان بخشوا دوں گا۔ میں تم کو سوچنے کے لئے وقت دیتا ہوں۔ دیکھو! تم نے برطانیہ کی خاطر اپنے ملک کے غریب لوگوں سے غداری کی ہے۔ تم اُس ملک کے خلاف کام کرتے رہے ہو، جو تمہارے اپنے ملک کے عوام کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اب بھی تم توبہ کر لو، تو سوویت انصاف تمہیں معاف کر دے گا۔ ......"

ہردت کو پھر سے کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ M·G·B کو اُس کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں بہت دن لگیں گے مگر اگلی پیشی میں اُس نے جان لیا کہ اُس کے خلاف مقدمے کی تیاری سالوں سے ہو رہی تھی جب

۱۹۵۳ء کے اگست میں اُسے رہا کیا گیا تھا، تب بھی اس جاسوسی کے الزام کی تیاری ہو رہی تھی وہ جہاں اور جس کا بھی کچھ دوست بنا تھا، اُس کی چھوٹی سے چھوٹی اطلاع بھی اُن کے پاس درج ہے۔ گریگوری وِچ کے ساتھ کی گئیں چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی ان کے سامنے لکھی ہوتی ہیں۔ ......

اُس کی غیر قانونی کارروائیوں کی باتیں پڑھی گئیں۔

۱۔ جمبول ڈسٹرکٹ کے رٹیڈی سرکل میں جانے سے اُس نے انکار کیا تھا، لہٰذا، ظاہر ہے کہ وہ سوویت یونین میں سیاسی ٹریننگ لینے کے لئے نہیں آیا تھا۔ بلکہ جاسوس تھا۔

۲۔ اُس نے ایک، قلاک کی بیٹی سے شادی کی، جو ثابت کرتی ہے کہ وہ انقلابی نہیں ہے۔

۳۔ جب وہ خراد کا کام کرتا تھا، تو پارٹی کی ضلع کمیٹی کو اڑتالیس برٹک بولٹ چاہیئے تھے جب کہ اُس نے صرف اٹھارہ تیار کئے تھے تاکہ انقلاب کے کام میں رکاوٹ پڑ جائے۔

۴۔ اُس نے کئی بار سوویت ٹیکسوں کی، چناؤ سسٹم کی، دواؤں کے انتظام کی اور ٹریڈ یونین کی نکتہ چینی کی۔

۵۔ ایک بار اُس نے جمبول سے بھاگ کر ماسکو جانے کی کوشش کی تاکہ راجدھانی میں پہنچ کر جاسوسی کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔

۶۔ ایک سوموار کو جب خوب بارش ہوئی تھی، وہ جمبول کے اتوار بازار میں گیا تھا۔ اُس دن سڑکیں پانی اور کیچڑ سے بھری پڑی تھیں۔ واپسی پر اُس نے ڈسٹرکٹ کی ایک کلرک عورت کا بھاری سا تھیلا اُٹھا کر اس کی مدد کرنی چاہی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ بڑے مہربان سبھاؤ والی ہے۔ لیکن اتنا بوجھ اُٹھانے کے بعد جب وہ کیچڑ سے بھرے راستے سے گزر کر گھر

پہنچا تو اُس کے پالش کئے ہوئے بوٹوں پر کیچڑ کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی غریب گھر کا نہیں، بلکہ کسی رئیس گھر کا ہے کیونکہ محنت مزدوری کرنے والوں کو بارش اور کیچڑ سے اپنے جوتے بچانے نہیں آتے۔ اس لئے کسی بگڑے ہوئے رئیس کا بیٹا انقلابی نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور ایک جاسوس ہے......

ہردت نے کاغذوں کی طرف سے منہ موڑ لیا اور کہنا چاہا "اگر آپ لوگ ثبوت اکٹھے کرنے میں اتنے ماہر ہیں تو آج یہ ثبوت کیوں نہیں کھو جا کہ جب میں اسکول کی ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا، جب میں چودہ برس کا تھا، تب کنگ جارج پنجم کے جنم دن پر میں نے ہندوستان کو غلام بنانے والے بادشاہ کی تصویر جلائی تھی......

۲۲

پیشیوں کے اس لمبے سلسلے کے دوران، اپنی صفائی میں ہردت جو کچھ کہتا رہا، اُس کا لب لباب یہ رہا—— "میں سوشلسٹ نظام کا مخالف نہیں ہوں... — میرے خلاف باتیں پہنچانے والے لوگوں کو اگر سامنے لایا جائے، تو میں ثابت کر دوں گا کہ میں نے نوکر شاہی کے طریقوں کی نکتہ چینی کی تھی، سوویت نظام کی نکتہ چینی نہیں کی تھی۔ اگر یہ نکتہ چینی جرم ہے تو میں سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں...... مگر میں کسی کا جاسوس نہیں ہوں اور اس سے متعلقہ کاغذوں پر دستخط نہیں کروں گا۔"

ہردت کی جو رقم پولیس کے پاس جمع تھی، اُس کے حساب میں سے وہ اپنے

لئے مزید خوراک وغیرہ خرید سکتا تھا۔ لیکن بتایا گیا کہ صرف تمباکو خرید سکتا ہے۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا، اس لئے تمباکو اُس کی ضرورت کی چیز نہیں تھی۔ اس پر ہردت نے غصے میں آکر بہت سارا تمباکو خرید لیا اور کاغذ کے ٹکڑوں میں لپیٹ کر اُسے پینے لگا اور صرف کالی روٹی کو پانی میں بھگو کر کھانے لگا تاکہ کسی کو اُس کی بھوک ہڑتال کا پتہ نہ چل جائے ...... اُس کا خیال تھا کہ اس طرح آہستہ آہستہ مرتا ہوا، وہ کچھ ہفتوں کے بعد جیل کی اس کوٹھری سے اپنے آپ چھوٹ جائے گا۔ لیکن دن بدن کمزور ہوتے ہوتے ایسے لگا کہ اُس کے ہوش و حواس کھونے لگے ہیں، پھر بھی موت کہیں بھی آس پاس نظر نہیں آرہی......

اگلی ایک نئی پیشی کے وقت، جب سنتری ہردت کو چھوڑ کر چلا گیا تو افسر نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ہردت کو نزدیک بٹھا کر کہنے لگا —— "کیا تم حیران نہیں ہو کہ میں نے تمہیں کبھی بھی اذیتیں نہیں دیں۔ جہاں تک میرے ذاتی یقین کا سوال ہے، مجھے یقین ہے کہ تم جاسوس نہیں ہو۔ لیکن اگر میں یہی بات اوپر والے آفیسروں سے کہہ دوں تو اسی وقت میں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ مجھے اسی کرسی پر بٹھا دیا جاؤں گا، جس کرسی پر تم بیٹھے ہو۔ میں اس طرح کی بے معنی موت نہیں مرنا چاہتا۔ اگر تم نے اس اقبالی بیان پر دستخط نہ کئے تو اسی کوٹھری میں پڑے پڑے مر جاؤ گے یا تمہیں گولی مار دی جائے گی۔ لیکن اگر تم دستخط کر دو تو اس کوٹھری میں سے نکال کر تم کو کسی لیبر کیمپ میں بھیج دیا جائے گا۔ جہاں کھلی ہوا بھی ہو گی اور باتیں کرنے کے لئے ساتھی بھی ...... اور پھر کیا معلوم کہ وقت کب اور کس طرح بدل جائے......"

ہردت حیران ہوا، جب آفیسر نے کہا —— "میں نے اس وقت M-G-B کی وردی پہن رکھی ہے لیکن آخر تو روسی ہی ہوں، میری روح اسی مہم کی ہے

جس نے ٹالسٹائی، لیٹر منٹو اور پوشکن جیسے لوگ پیدا کئے تھے، جنھوں نے کبھی بھی ظلم اور تشدد کا ساتھ نہیں دیا تھا۔۔۔۔۔۔"

ادر آفیسر نے ایک گہرا سانس بھر کر کہا ——— "کل اگر میرا تبادلہ ہو گیا، تو نیا آفیسر تمہیں بھیانک اذیتیں دے کر دستخط کروالے گا۔ اس سے اچھا یہی ہے کہ تم ابھی دستخط کردو اور اس عذاب سے چھٹکارا پاکر لیبر کیمپ میں چلے جاؤ۔"

یہ ایک دل چیر دینے والی گھڑی تھی۔ جب ہردت کو لگا کہ اُسے آج تک جو بھی دو آنکھوں سے دکھائی دیتا تھا، وہ پورا سچ نہیں تھا ان دکھائی دے رہی حقیقتوں سے آگے ایک اور حقیقت ہے، جسے دیکھنے کے لئے آج اُس کی تیسری آنکھ کھل رہی تھی۔۔۔ کاغذ کو دیکھتے ہوئے اُس نے اس پر دستخط کر دیئے۔۔۔۔۔

اگلے ہفتوں میں ہردت کی کوٹھڑی کا جو بھی دوسرا ساتھی بنتا رہا، اُس کی آپ بیتی ایک عجیب حقیقت کی تہیں کھولتی رہی۔

اُن میں سے ایک، لنگڑا اور بوڑھا روسی تھا، جو جنگ کے دنوں میں جنگی محاذ پر سگنل دیا کرتا تھا۔ دشمن کے گولہ بارود کے ایک بہت بڑے گودام کو اڑاتے ہوئے اس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے تھے اور اس کی اب گرفتاری سے پہلے ہی ایک ڈاکٹر نے معائنہ کر کے کہا تھا کہ وہ مشکل سے چھ ماہ زندہ رہ پائے گا۔ اس پر غیر سوویت ایجی ٹیشن کرنے کا الزام تھا لیکن وہ سیاست سے اتنا بھی واقف نہیں تھا کہ جب اُس پر منارکسٹ ہونے کا الزام لگایا گیا تھا تو وہ کہنے لگا ——— "فاشسٹ لفظ تو میں نے سُنا ہوا ہے لیکن منارکسٹ کیا ہوتا ہے؟" ——— اُس کی حالت ان پیشیوں کے دوران اتنی بگڑتی چلی گئی کہ ایک دن کوٹھڑی ہی میں بیہوش ہو گیا۔ ایک سنتری اٹھاکر اُسے کہیں لے گیا۔ لیکن ہردت نے پھر کبھی اُس کی صورت نہیں دیکھی۔

اسی طرح ہردت کی کوٹھری میں ایک بار ایک انجنیئر تھا، جس نے جنگ کے دوران مقررہ وقت سے پہلے ہی ریلوے لائن بچھادی تھی۔ اب اس پر الزام تھا کہ اُس نے جرمن فوجوں کے لئے وہ لائن جلدی سے تیار کردی تھی تاکہ وہ فوجیں آگے بڑھ سکیں۔ وہ انجنیئر کہتا تھا کہ وہ خودکشی کرلے گا مگر جھوٹے الزام کے کاغذوں پر دستخط نہیں کرے گا۔ وہ ایک بار پیشی پر گیا تو لوٹ کر واپس نہیں آیا۔

اسی طرح ایک یوکرینی جوان تھا، واسیہ نام کا، جو جرمن حملے کے وقت اپنا گاؤں خالی ہونے پر عالم آتا کی ایک فیکٹری میں کام کرنے لگا تھا۔ وہاں اُس کی دوست لڑکی نے کچھ راشن کارڈ چرائے تھے جو واسیہ نے باہر بیچ دیئے تھے۔ اس کی سزا ہونے پر اُس نے آفسروں سے کہا کہ جیل کوٹھری میں بند رہنے کی بجائے وہ جنگی محاذ پر جاکر لڑنا چاہے گا۔ وہاں ایک دن جب جوان سپاہی دشمن کی چوکی پر حملہ کرکے دشمن کی مشین گنوں سے مر رہے تھے تو اُس کا کمانڈر پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ تب واسیہ اور کئی ساتھی دشمن کے قبضے میں آگئے تھے۔ وہ جنگی قیدی جب چھوٹ کر واپس آئے تھے تو اُن کے سواگت کے لئے محاذ پر سجاوٹ کی گئی تھی۔ لیکن کچھ دوری پر اُن کے لئے جیلوں کی لاریاں کھڑی تھیں . . . . . .

۱۹۴۷ء کا فروری مہینہ ختم ہونے کو تھا، جب جیل کے بڑے وارڈن نے ہردت کو بُلا کر ایک کاغذ سامنے رکھ دیا اور دستخط کرنے کے لئے کہا۔

" یہ کیسا کاغذ ہے؟" —— ہردت نے پوچھا تو وارڈن نے کہا —— "تمہاری سزا کا حکم۔ تم کو پچیس سال سائبیریا میں رہنے کی سزا ہوئی ہے۔"

اُس وقت کاغذ پر دستخط کرتے ہوئے ہردت کو پوری طرح ہوش نہیں رہا کہ وہ اس کاغذ کے لفظ دو آنکھوں سے پڑھ رہا ہے کہ تیسری آنکھ سے بھی . . . . .

۲۳

شاہی محلوں کے دیوان عام اور دیوان خاص کی طرح اُن دنوں سوویت جیلوں کی بھی کوٹھری عام اور کوٹھری خاص ہوا کرتی تھیں۔ خاص صرف اُن قیدیوں کے لئے تھی۔ جن کو سزائیں سنائی جا چکی تھیں۔ لیکن ابھی اُن کو لیبر کیمپوں میں بھیجنا باقی ہوتا تھا۔

عام اتا جیل کی جس خاص کوٹھری میں ہردت کو ڈالا گیا، اُس میں اس وقت چودہ قیدی تھے۔ اگلے دو ہفتوں میں جتنے قیدی باری باری سے نکال کر کسی لیبر کیمپ میں بھیجے گئے، تقریباً اتنے ہی نئے قیدی اُس میں ڈال دیئے گئے اور ہردت نے غور کیا کہ عام کوٹھری والوں کو ابھی بے میعاد پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے، اس لئے وہ اُمید اور ناامیدی کے درمیان لٹکے ہوئے جتنے دکھی ہوتے ہیں، اتنے یہ دس، پندرہ یا پچیس سالوں کی میعاد والے اور ناامیدی کے کنارے لگ چکے خاص کوٹھریوں والے دکھی نہیں ہوتے۔

ہردت والی کوٹھری میں ایک بڑا ہنس مکھ بزرگ قیدی تھا، جسے پانچ سال کی قید سنائی گئی تھی۔ ایک دن ہردت نے اُسے کہا — "آپ پھر بھی خوش نصیب ہیں کہ آپ کا پانچ کی گنتی پر ہی چھٹکارا ہو گیا۔" اس پر وہ افسوس سے سر ہلا کر کہنے لگا۔ "دوست! زخموں پر نمک کیوں چھڑکتے ہو؟ میرے ساتھ تو اسٹالن نے انصاف نہیں کیا کہ اُس نے میری زندگی صرف پانچ سال ہی گنی۔ میرا ایک دوست ہے، بہتر سال کا۔ اس کو پچیس سال کی سزا سنائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تو پورے سو سال زندہ رہے گا۔ دیکھو، اس اپنی اپنی میعاد سے پہلے کوئی نہیں مر سکتا۔ کیونکہ اگر کوئی مر جائے تو اسٹالن کی حکم عدولی کی وجہ سے اُسے کونٹر ریوولیوشنری سمجھ لیا جائے گا۔۔"

دو ہفتوں بعد ہردت کی اور جن قیدیوں کی باری آئی تو ان کو کوٹھڑی میں سے نکال کر کھلے پہاڑی کوتے سے، لاریوں میں ڈال کر اسٹیشن کی اُس گاڑی میں چڑھا دیا گیا، جو پہیوں والی کال کوٹھڑیوں جیسی بنی ہوئی تھی۔

تین دن بعد یہ گاڑی نوووسیبرسکی (NOVOSEEBEEPSKY) نام کے شہر میں پہنچی، جو سائبیریا کے راستے کا پہلا پڑاؤ تھا، الگ الگ لیبر کیمپوں میں بھیجنے کے لئے۔

یہاں دو ہفتے کے قیام، کے بعد ہردت کو اور دیگر دو سو قیدیوں کو مال گاڑی میں بھر کر تائیشیت (TAISHET) بھیج دیا گیا۔ یہ سات دنوں کا راستہ رہی سہی جان نچوڑ دینے والا تھا۔

اس اسٹیشن سے شہر کی جیل زیادہ دُور نہیں تھی۔ اس لئے قیدیوں کی گنتی کر کے خونخوار کتوں اور ہتھیار بند سپاہیوں کی حفاظت میں، جب اُن کو شہر سے جایا گیا تو ہردت حیران ہوا کہ شہر کے لوگ اُن کی طرف دیکھتے تک نہیں تھے، جیسے وہ عام معمولی بھیڑوں کا ایک ریوڑ جا رہا ہو۔ . . . . .

یہ بھی راستے میں قیدی اسٹاپ اڈہ تھا، جہاں قیدیوں کی جسمانی حالت کے مطابق، ان کو الگ الگ کیمپوں میں بھیجنا ہوتا تھا۔ اس جیل کو نوفٹ اونچی کانٹے دار تاروں کی دیوار سے الگ کر کے دو حصوں میں بانٹا ہوا تھا، ایک زنانہ اور ایک مردانہ۔ مردانہ حصے میں ہردت نے دیکھا کہ یہودی اور مغربی یوکرین کے لوگ زیادہ تھے۔ ویسے سوویت یونین کے ہر علاقے سے لے کر دنیا کے ہر ملک کے لوگ تھے۔ صرف ہندوستان کی طرف سے وہ اکیلا ہندوستانی تھا۔ اس کے علاوہ جاپان، جرمنی اور اٹلی کے جنگی قیدی بھی تھے اور وہ سفید روسی بھی جو اکتوبر انقلاب کے وقت منگولیا، چین، ایخوریہ وغیرہ بھاگ گئے تھے، لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد، جب اسٹالن کے بلاوے پر واپس آ گئے تھے تو اُن سے جیلوں کی رونق بڑھائی گئی تھی۔

ان جیل کی بیرکوں میں تالے نہیں لگائے جاتے تھے، اس لئے بہت سے قیدی ایک سے دوسری برک میں آتے جاتے اور گھومتے وقت ایک دوسرے سے باتیں کر سکتے تھے۔ ایسے میں ہردت کو لگا کہ گویا یہ سب کا الوداعی ملن ہو ......

چودہ دن کے بعد ہردت کو اور دیگر کئی قیدیوں کو تائیشیٹ لیبر کیمپ یونٹ کے کیمپ نمبر ۵ میں بھیج دیا گیا۔

یہ کیمپ تائیشیٹ شہر اور انگرا دریا کے کنارے پر بسے ہوئے شہر براتسک کے درمیان میں پڑتا تھا۔ یہاں پہنچنے پر کیمپ کے بڑے آفیسر نے نوآمدہ قیدیوں کو کیمپ کے اندر کھلے میدان میں اکٹھا کر وا کر ایک تقریر کی جو کچھ یوں سوا گئی تقریر تھی ـــــ "کسی کو ڈرنا نہیں چاہیئے کہ وہ سائبیریا کے اس جنگل تائیگا میں سے زندہ واپس نہیں جائے گا۔ یہاں سب کے ساتھ اچھا سلوک ہوگا بشرطیکہ کامریڈ اسٹالن کے منصوبے کے مطابق وہ ایماندارانہ محنت سے کام کریں۔" اور اُس آفیسر نے یہ بھی کہا کہ اگر قیدی لوگ کیمپ ایڈمنسٹریشن سے تعاون نہیں کریں گے تو گولی سے مار دیئے جائیں گے۔

ہردت کو لگا کہ یہ تقریر جنگل میں سائیں سائیں کرتی ہوئی اور طوفان کی طرح گزرتی ہوئی ہوا ہے، جو کیمپ کی دہشت اور وحشت کی پہلی اطلاع ہے۔

بیرکوں میں قیدیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ رات کو وہاں تبھی سویا جاسکتا تھا، اگر ہر ایک کروٹ سے کر لیٹ جائے۔ ایک گھنٹہ دائیں کروٹ سونے کے بعد کوئی ایک قیدی آواز دے دیتا تھا کہ اب کروٹ بدل لو۔ اس طرح ایک ایک گھنٹہ بعد آواز والی نیند کو قیدی لوگ 'حکمی نیند' کہتے تھے۔

اس کیمپ کے قیدیوں کو ایک پرانے کیمپ کی بیرکوں کو گرانے اور گرے ہوئے عمارتی ملبہ کو اپنے کندھوں پر اس کیمپ میں لانے کا کام ملا ہوا تھا۔ یہ کام نان پر

پروڈکٹو یعنی بے حاصل و بے سود مانا جاتا تھا، اس لئے دوپہر کے وقت پر قیدی کو چھ سو گرام روٹی اور سڑی ہوئی بند گوبھی و آلو کے سوپ کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔

لگ بھگ تین ماہ بعد یہ قیدی پروڈکٹو کام پر لگائے گئے تو کچھ پیٹ بھر خوراک ملنے لگی۔ مگر یہ کام ریڑھ کی ہڈی توڑنے والا تھا۔ گھٹنوں تک برف میں دھنس کر چلنا پڑتا تھا، اس لئے یہ بات عام ہوگئی کہ کسی کے پاؤں بے کار ہو جاتے تھے، کسی کی انگلیاں جھڑ جاتی تھیں اور کسی کی ناک کی ہڈی گل جاتی تھی۔ یہ حادثہ ہروت سے بھی ہونے کو تھا، جب ایک دن ایک درخت کاٹتے وقت پاس والے قیدی نے دیکھا کہ ہروت کی ناک سفید رنگ کی ہوگئی ہے۔ اس نے بھاگ کر برف سے ایک مٹھی بھر کر ہروت کی ناک پر برف کو زور زور سے رگڑنا شروع کر دیا۔ ہروت سے چیخ اُٹھا۔ لیکن کچھ دیر اس برف مالش کے بعد مردہ ہوتے جا رہے ناک میں خون کی حرکت ہونے لگی۔

حکم تو روزانہ دس گھنٹے محنت کا تھا، لیکن برف میں سے گزر کر کام پر پہنچنے اور وہاں سے لوٹنے میں چار گھنٹے تو لگ ہی جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کام پر جانے سے پہلے کی اور کام سے واپس آنے کے بعد کی تلاشی پر چار گھنٹے لگ جانا معمولی بات تھی۔ لہٰذا، روزانہ کل ملا کر اٹھارہ گھنٹے لگ جاتے تھے۔ صبح کے وقت کیمپ کے بند گیٹ کے سامنے پانچ پانچ کی قطاروں میں پانچ چھ سو قیدیوں کو کھڑا کر دیا جاتا تھا اور ٹٹول ٹٹول کر ہر قیدی کے جسم اور کپڑوں کی تلاشی لی جاتی تھی۔ پھر گیٹ کھول کر قطار در قطار قیدیوں کو کئی ٹولوں کی شکل میں باہر کھڑے ہتھیار بند سپاہیوں اور خونخوار کتوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو اُن سے جنگل میں کام کرواتے تھے۔ پھر شام کو اُسی طرح وہ کام کرنے والے سپاہی، قیدیوں کو واپس کیمپ والے سنتریوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ جو قیدیوں کی گنتی کرتے تھے اور واپسی پر تلاشی بھی لیتے تھے۔ رات کی گنتی ایک گھنٹہ تو لے ہی لیتی تھی۔ لیکن اگر گنتی میں سنتری غلطی کر دیں تو یہ رسم دو تین گھنٹے لے لیتی تھی۔ اس لئے اگر کوئی قیدی کام کرتے کرتے مر جاتا تھا۔

تو اُس کے ٹولے کے قیدی اُس کی لاش اٹھا لاتے تھے تاکہ گنتی پوری ہو سکے۔

کسی قیدی کے بھاگ نکلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن قیدی کے مرجانے کا سوال ضرور پیدا ہوتا تھا۔ کئی قیدی کسی نہ کسی چیز سے بازو کی یا ٹانگ کی نس چیر کر خودکشی کر لیتے تھے۔ ایسے بھی تھے جو بائیں ہاتھ کی دو چار انگلیاں کاٹ لیتے تھے تاکہ پانچ چھ ماہ کے لئے جان توڑ کام سے بچا جا سکے۔ کچھ وہ بھی تھے جو اپنے بریگیڈیئر یعنی لوٹے کے قیدی لیڈر یا فورمین وغیرہ کو قتل کر دیتے تھے، تاکہ تفتیش اور مقدمے کے لمبے عرصے میں وہ مشقت سے بچ سکیں۔ اس سے ان کو کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا تھا کیونکہ ان کی پچیس سال کی سزا از سرِ نو شروع ہو جاتی تھی۔ جب کہ وہ پہلے دو تین سال کاٹ ہی چکے ہوتے تھے۔

جس طرح یہ قیدی دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک مشقت کرنے، اور دوسرے مشقت کروانے والے۔ اسی طرح مشقتی بھی آگے تین طرح کے تھے۔ ایک وہ جو سیاست سے بالکل بے بہرہ تھے یا کچھ وہ جن کی تھوڑی دلچسپی سیاست سے ہو گئی تھی، جس کے لئے وہ اپنی قسمت کو کوستے رہتے تھے اور چپ چاپ مشقت کرتے رہتے تھے۔ ایسے قیدیوں کی تعداد کوئی اسی فیصد تھی دوسری طرح کے وہ قیدی تھے جو بہت کم تعداد میں تھے۔ جن کو بیماریوں نے اتنا ناکارہ بنا دیا تھا کہ کسی بھی کام کے قابل نہیں رہے تھے۔ وہ چپ چاپ ایڑیاں رگڑتے مر رہے تھے اور تیسری قسم کے وہ جوان قیدی تھے، جو اچھے خاصے پڑھے لکھے تھے، سیاست کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اور سوچتے تھے کہ کڑی محنت کرنا ــــ آج کے نظام کو طاقتور بنا کر اپنی ہی زنجیروں کو مضبوط کرنا ہے: یہی تیسری قسم کے قیدی تھے، جن کو خطرناک قرار دے کر کڑی نگرانی تلے رکھا جاتا تھا۔

ہر کیمپ کا کلچرل سیکشن قیدیوں کو نئے سرے سے تعلیم یافتہ کرنے کے لئے ہوتا تھا یہاں زیادہ تر کتابیں اسٹالن کی یا اُس کے بارے میں پبلش شدہ تھیں۔ یا دوسرے لیڈروں

کی تقریریں ہوتی تھیں جو جلدیں باندھ کر وہاں رکھی جاتی تھیں۔ اخباروں کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ مہینے میں ایک بار کلچرل سیکشن کوئی "منورنجن" پروگرام پیش کرتا تھا۔ جس میں قیدیوں کو مخاطب کر کے کہا جاتا تھا کہ وہ کیمپ کے پروڈکشن منصوبے کو جی جان سے محنت کرتے ہوئے پورا کریں۔ ہردت نے دیکھا کہ جو تھوڑے سے قیدی اس کلچرل سیکشن کے کام میں دلچسپی رکھتے تھے یا دلچسپی ظاہر کرتے تھے، اُن کو کھانے کے لئے کچھ زیادہ دیا جاتا تھا۔

سال میں تین بار گلاگ یعنی ملک کے لیبر کیمپوں کے سنٹرل ایڈمنسٹریشن سے ایک کمشن آتا تھا، جسے کیمپ کے بخوبی تندرست اور مضبوط تین قیدی چن کر، ان کو ان کیمپوں میں بھیجنا ہوتا تھا جہاں پروڈکشن منصوبہ پورا نہیں ہو رہا تھا اور اس لئے زیادہ محنت کر سکنے والوں کی وہاں ضرورت تھی۔

ماہ اپریل ۱۹۵۰ء کی بات ہے، جب قیدیوں کے لئے نمبر بانٹے گئے یہ نمبر ناموں کی جگہ استعمال کرنے تھے، جو چار انچ چوڑے آٹھ انچ لمبے کپڑوں پر لکھ کر قیدیوں کے کوٹوں، قمیضوں، پاجاموں اور ٹوپیوں پر سی دیئے جاتے تھے اس وقت ہردت کا نام ۶۶۶ ہو گیا۔

۲۴

۱۹۵۱ء کے درمیان میں، جب ہردت تائیشیٹ یونٹ کے کیمپ نمبر ۰۴ میں تھا تو ایک دوسرے قیدی بریگیڈ کا ایک قیدی اُس کا کچھ دوست سا بن گیا تھا۔ اُس کے اس دوست نے اُس کو بتایا کہ چار قیدی مل کر یہاں سے بھاگنے کی سوچ رہے ہیں، جس کے لئے انہوں نے جنگل کے کٹے درختوں کی بڑی بڑی زمین دوز جڑوں کو اکھاڑنے کے لئے ملے بارود میں سے، ہر روز بچا بچا کر تھوڑے سے بم بنا لئے ہیں۔ ہردت کے اُس دوست نے پوچھا۔ "تم اگر ہمارے ساتھ ملنا چاہو، تو میں تمہارا تبادلہ اپنے بریگیڈ میں کروا سکتا

ہوں۔"

"میں اس دوزخ میں سے نکلنا ضرور چاہتا ہوں، لیکن، ہم بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ جنگل کو پار کرنے میں ہمیں تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ راستے میں نہ تو پھل دار درخت ہیں اور نہ ہی بیر وغیرہ کی جھاڑیاں۔"

ہردت نے کہا اور اُسے کیمپوں میں سُنی ہوئی وہ بھیانک کہانیاں یاد آگئیں۔ کہ جنہوں نے بھاگ کر کوئی راستہ کھوجنا چاہا تھا، آخر وہ بھوک کے ہاتھوں ایک دوسرے کو مار کر ایک دوسرے کا گوشت کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"نہیں دوست، میں دل و جان سے تم لوگوں کی کامیابی چاہتا ہوں، لیکن خود تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا"—— ہردت نے کہا، اور تھوڑے سے دنوں کے بعد ہی شام کے پانچ بجے، دور سے کہیں بندوقیں چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر آدھے گھنٹے بعد ایک زخمی آفیسر اور زخمی ہوگئے کتے کو لوٹتے ہوئے دیکھا۔ اُس وقت ہردت والے قیدی بریگیڈ کے سپاہی نے بتایا کہ آج جو چار قیدی بھاگ گئے تھے، اُنہوں نے اُن کا پیچھا کرنے والے آفیسروں میں سے ایک کو زخمی کر دیا ہے۔

رات کو جب سبھی قیدی بیرکوں میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خرلاموہ نام کے قیدی نے ہردت سے پوچھا—— "تم نے سُنا ہے کہ بھاگنے والوں نے بم چلائے تھے اور ایک آفیسر زخمی ہو گیا تھا؟" اس پر ہردت کے منہ سے نکلا—— "افسوس یہی ہے کہ وہ مرا نہیں۔"

اور اگلی صبح سے ہردت کی گنتی، دوسرے پچیس قیدیوں سمیت، خطرناک، قیدیوں میں ہونے لگی اور اس کا نتیجہ نکلا کہ ہر دو ماہ بعد ہردت کا تبادلہ کسی نئے لیبر کیمپ میں کر دیا جاتا۔

لیکن ہردت نے خوش ہو کر دیکھا کہ، خطرناک، قیدیوں سے خوف زدہ آفیسر بھلے ہی انہیں اتنی سخت نگرانی میں رکھتے تھے کہ کام پر جاتے وقت اُن کو ہتھکڑیاں بھی پہنادی جاتی تھیں اور چار چار قیدیوں کے لئے ایک ایک مسلح سپاہی اور دو چار شکاری کتے بھی ہوتے تھے، لیکن کیمپ کے رسوئیے اُن سے ڈر کے مارے اُن کو زیادہ روٹی اور گاڑھا سوپ دینے لگے تھے۔ساتھ ہی دونوں وقت کی حاضری اور جامہ تلاشی کے لئے ایک خاص سنتری لگا دیا گیا تھا اور اس طرح اُن کو گھنٹوں برفانی ہوا میں کھڑا نہیں رہنا پڑتا تھا۔ اُدھر روزانہ کام کے کوٹے کو چاہے وہ پورا نہ بھی کریں، تو بھی اُن کی خوراک میں کمی نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ گرمیوں کے دنوں میں اُن کو بند لیکن خاص بیرک میں خاص نگرانی تلے رکھا جاتا تھا۔ کیوں کہ وہ دن قیدیوں کے بھاگنے کے لئے کچھ آسان گنے جاتے تھے۔ لہذا خطرناک، قیدیوں کو مشقت سے چھٹی مل جاتی تھی۔

یہی ۱۹۵۲ء کے گرمیوں کے دن تھے، جب ہردت اور کچھ مغربی یوکرین کے جوان قیدی بند خاص بیرک میں' چھٹی' منا رہے تھے کہ ایک دن یوکرینی قیدی رد میں آکر آزادی کا گیت گانے لگے۔ اُن کی زبان تو ہردت نہیں جانتا تھا لیکن طرز اور لے میں کشش ضرور تھی اور آوازوں میں جوش بھی۔ اور ہردت چارپائی کے لکڑی کے تختے کو طبلہ سا بنا کر بجانے لگا۔ انہوں نے ہردت کو گیت کا لب و لباب بعد میں بتایا تھا ‌‌-‌‌‌‌ "لال جھنڈے کو اُتار کر، ہم اپنے ملک پر ملک کا جھنڈا لہرائیں گے۔"

اگلے دن سے سزا کے طور پر ان خطرناک، قیدیوں کا کھانا دو ہفتوں کے لئے صرف پانی اور ڈھائی سو گرام روٹی مقرر کر دیا گیا۔ یوکرینی جوانوں نے اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے بھوک ہڑتال کرنے کی اسکیم بنائی۔ اُن کے سوال کے جواب میں ہردت نے کہا "پروٹسٹ کے لئے بھوک ہڑتال ایک اچھا طریقہ ہے، اس لئے اصولی طور پر میں آپ لوگوں کا ساتھ

دوں گا، لیکن جب تک ہماری مانگ پوری نہ ہو جائے، تب تک بھوک ہڑتال توڑنا نہیں۔"

بھوک ہڑتال کے تیسرے دن وہ بھوک ہڑتالی یوکرینی جوان کہنے لگے ـــ "یہاں کی سرکار بھوک ہڑتال کو تسلیم نہیں کرتی، لہٰذا فضول کی موت مرنا ٹھیک نہیں رہے گا۔" اس پر ہردت نے کہا ـــ "آپ لوگ بے شک بھوک ہڑتال توڑ لو، لیکن میں جاری رکھوں گا، کیونکہ جس ماحول میں مَیں نے تعلیم و تربیت پائی ہے، وہ آپ لوگوں کے تعلیمی و پرورشی ماحول سے مختلف ہے۔" انھوں نے اپنی مرضی کر لی اور ہردت اپنی مرضی پر اڑا رہا۔

ہردت کی بھوک ہڑتال کے پانچویں دن، اُسے ایک آفیسر کے پاس لے جایا گیا، جس نے ہردت کو سمجھانا چاہا ـــ "ہم جانتے ہیں کہ تمہارا گاندھی اس طرح کی بھوک ہڑتال سے انگریزوں کو ڈرا لیتا ہے۔ اور تم بھی گاندھی کے بورژوا چیلے ہو، لیکن اس طرح کی دھمکیاں سوویت یونین میں نہیں چل سکتیں۔" جواب میں ہردت نے کہا ـــ "میں کس کا چیلا ہوں، اسے میں خود بخوبی جانتا ہوں۔ مجھے کسی کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ سوویت یونین اپنے نظام کو جمہوری سوشلسٹ نظام کہتا ہے، پھر یہ بھوک ہڑتال غیر قانونی کس طرح ہو گئی؟"

آفیسر نے آگ بگولا ہو کر کہا ـــ "ایسا لگتا ہے کہ تم نے اصول کی خوراک کچھ زیادہ ہی پی لی ہے۔" پھر اُس نے سنتری کو بُلا کر کہا ـــ "اسے تنہا کوٹھری میں بند کر دو اور کوٹھری کو تب کھولنا، جب اُس میں سے مُردے کی بدبو آنے لگے۔"

آفیسر کے حکم کی تعمیل ہونے کے بعد، بھوک ہڑتال کے چھٹے دن چھت کی طرف تاکتے ہوئے ہردت کو یوگ ازم کے بارے میں، اپنے پتا کی ایک بات یاد آ گئی ـــ "من بیٹے! ایک یوگی بڑی سے بڑی اذیت کو بھی ہنس کر جھیل سکتا ہے۔ تم یوگ آسن کیا کرو۔" اور اب ہردت کے کانپتے ہوئے ہونٹ، ہونٹوں میں ہی کہنے لگے ـــ "پتا جی! مجھے وہ یوگی دکھا دیجئے جو اس طرح کی کوٹھری میں پڑ کر بھی ہنس سکے!"

اور اُس شام ہردت کو بھوک ہڑتال والے سارے دنوں کی پوری خوراک دینے کا حکم ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد ہردت کو دیگر بیس خطرناک، قیدیوں سمیت ایک نئے کیمپ میں بھیج دیا گیا، جہاں چند دنوں بعد ہی ایک کمشن آیا جو قیدیوں میں سے تکنیکی جانکاری والے قیدی کو کھوج رہا تھا۔ ہردت چونکہ خراد کا کام جانتا تھا۔ اس لئے اسے اُس کیمپ میں بھیج دیا گیا، جہاں، آٹومیکینکل ریپئر پلانٹ لگا ہوا تھا۔ وہاں اسے خوراک بھی اچھی ملنے لگی اور روزانہ تھوڑا سا تمباکو بھی۔

وہاں ہردت والی ورکشاپ کا فورمین دس سال کی قید بھگتنے کے بعد، اُسی شہر میں رہ کر، بیبر کیمپ کی نوکری کرتا تھا۔ خراد پر کام کرتے ہوئے ہردت کو وہ فورمین اپنے دفتری کمرے میں بُلا لیا کرتا تھا، سگریٹ پیش کر دیتا تھا اور دو ایک سگریٹ پیتے پیتے وہ دونوں گپ شپ بھی اُڑا لیا کرتے تھے ایک دن فورمین نے ہندوستان سے متعلق باتیں پوچھتے ہوئے ہردت سے سوویت نظام کے بارے میں پوچھا۔ ہردت نے جواب میں کہا — "بات یہ ہے دوست! ہمیں یہاں لینن کی ضرورت ہے۔ میں اس نظام کی بنیادی تہہ میں یقین رکھتا ہوں۔ مجھے کئی سال قید میں پڑے ہوئے ہو گئے ہیں، لیکن میں سوچتا ہوں کہ آج خوف زدہ حاکموں سے جو غلطیاں ہو رہی ہیں، اُن کا سوشلزم کے بنیادی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سختی والے مضبوط ارادے ضروری ہیں لیکن اُن میں انسانیت کا نظریہ قائم رہنا چاہیئے۔ یہ چان کائی شیک، یہ ہٹلر، یہ بیریہ ہر نظام میں پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن مجھے پکا یقین ہے کہ آخر میں یہاں لینن والا سوشلزم آ جائے گا۔۔۔۔"

اس وقت فورمین کو حیرانی ہوئی اور اُس نے پوچھا — "جن لوگوں کو انقلاب دشمن کہہ کر جیلوں اور کیمپوں میں ڈال دیا گیا ہے، تم اُن میں سے کتنوں کو انقلاب دشمن سمجھتے ہو؟"

ہردت اپنی تیسری آنکھ کے جلو سے آنے والے کل کے وقت کو دیکھتا ہوا جو کچھ کہہ رہا تھا، اُس سے لوٹ کر "آج" کے وقت پر آیا، تو وہ کچھ چُپ سا ہو گیا، اُس کی تیسری آنکھ بھی ایک دوبار جھپک کر کچھ نیچی ہو گئی۔ کہنے لگا — "کوئی نہیں دیکھا۔ ان میں سے کوئی بھی جاگیردار، بینکر، انڈسٹریلیٹ، بیوپاری سرمایہ دار وغیرہ نہیں ہے

۸۰ فیصدی کسان اور مزدور ہیں، سیدھے سادے کسان اور مزدور، جن کو سیاست کا کوئی علم نہیں۔ یا وہ لوگ ہیں، جو پڑھے لکھے ہیں، جنہوں نے اسی نظام کی حمایت میں کام کیا تھا۔ زیادہ تر قیدی ایسے ہیں جنہوں نے اکتوبر انقلاب کے دوران یا اُس سے چند سال بعد جنم لیا تھا۔ کچھ ایسے بھی دیکھے جو انقلاب کی خاطر روسی زار کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے ...... اس لئے میں کئی بار بہت حیران ہو جاتا ہوں کہ کس جگہ پر اور کس سے یہ غلطی ہو گئی ہے کہ ایک بہت خوبصورت نظام کی ساری صورت بگڑ کر اتنی بھیانک ہو گئی ہے ... کر دی گئی ہے ......"

۲۵

اگلے دن ہردت کو کام پر جانے سے روک لیا گیا۔ شام کو اُس کی بیرک میں آکر اُس کے ایک دوست نے کہا ——— "ہردت، تم بالکل ہی گدھے ہو۔ کل تم فورمین کے ساتھ جو باتیں کر رہے تھے، وہ کسی آفیسر نے سُن لی ہیں۔ اب تم کو بہت خطرناک" قیدیوں والے کیمپ میں بھیج دیا جائے گا"...... اور ہفتہ نہیں گزرا تھا، جب ہردت کو اُس نئے کیمپ میں بھیج دیا گیا، جہاں کے قیدی خدا سے موت کی دعا مانگتے تھے۔

یہاں ہردت کی دوستی ایک اُس قیدی سے ہو گئی جو شنگھائی سے واپس اپنے ملک لوٹا تھا اور جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہ روسی، اچھا پڑھا لکھا اور سنجیدہ آدمی تھا۔ اس لئے ہردت اُس سے کئی ایسے سوال پوچھنے لگا جس کا جواب اُسے خود ملتا نہیں تھا۔

"دوست! مجھے یہ بتاؤ کہ ماؤ کی سرخ فوج نے پورا چین جیت لیا، لیکن جنوبی کوریا اور فارموسا پر قبضہ کیوں نہیں کر سکی؟" ——— ایک دن ہردت نے جب یہ پوچھا تو اُس کا یہ دوست ہنس دیا ——— "تمہارا سوال واجب ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ

ماؤ امریکیوں کے پھیر میں آگیا ہے۔"

ہردت ہکا بکا ہو کر رہ گیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا، تب اُس نے کہا ۔۔۔۔

"دیکھو سیاست کے داؤ پیچ اپنے ہی ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء کا اکتوبر انقلاب کامیاب ہو گیا تھا، اُس کا حشر فرانس والے انقلاب جیسا نہیں ہوا۔ لہذا، مغربی طاقتیں گھبرا گئیں۔ انقلاب کے دوران اور بعد، خانہ جنگی میں بھی مغربی طاقتوں کی مسلح دخل اندازی کا ہاتھ تھا، لیکن اندرونی اور بیرونی رجعت پسندوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب مغربی طاقتیں جان گئیں کہ جب تک، روسی عوام بالشوکوں کا ساتھ دیں گے، تب تک سوویت سرکار کا کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا اور ایسی صورت میں سوشلسٹ نظام کی کامیابی کو روکنا ناممکن ہے۔ یہ دیکھ کر اینگلو امریکن بلاک کا سٹپٹا جانا ایک قدرتی بات تھی۔ مگر جب تک لینن زندہ تھا، یہ بلاک کچھ نہیں کر سکا۔ لینن کی موت کے بعد، بالشوک پارٹی میں پڑ گئی پھوٹ نے پارٹی کی اندرونی سیاسی کھینچا تانی نے اینگلو امریکن بلاک کو سنہری موقع دے دیا کہ سوویت روس کی عوامی طاقت کو گمراہ کر کے سوشلسٹ نظام کے خلاف کر دے وہ بلاک جانتا تھا کہ بیرونی طاقت تب ہی اثر انداز ہو سکتی ہے جب وہ اندرونی مخالفت کو اپنے ساتھ ملا لیتی ہے۔"

"لیکن ...." ہردت کچھ کہنے لگا تھا کہ اُس کا دوست اپنی بات آگے بڑھانے لگا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ یہ بلاک سوویت روس کی تعمیراتی ترقی کو روک نہیں پایا، لیکن اُس کی رفتار کو کم ضرور کر پایا ہے۔ پھر اس بلاک نے ہٹلر کا منہ سوویت روس کی طرف موڑ دیا، کیونکہ وہ روسی عوام کو کافی حد تک گمراہ کر ہی چکا تھا۔ اس لئے لوگوں کی بے دلی نے ہٹلر کو سوویت روس پر حملہ کرنے کی ہمت دے دی۔ لیکن لوگ تو آخر روس کے لوگ تھے، اُن کی نظر بھی جاگ اُٹھی اور فاشسٹوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی جاگ اُٹھا ...."

"لیکن تم نے چین پر امریکن اثر کی بات کس طرح کہہ دی ؟"

ہردت نے پوچھا، تو اُس کے دوست نے کہا —— "ہندوستان جب برطانوی طاقت کے ہاتھ سے نکل گیا، تو ایشیا میں سوویت اثر ور سوخ کو روکنے کے لئے امریکہ کو ایشیا میں کوئی جگہ چاہیئے تھی، خاص کر وہ جگہ جو سوویت روس کے ساتھ لگتی ہو۔ ویسے تو جمہوریت کے نام پر امریکہ نے کوشش کی تھی کہ ہندوستان کو اپنی طرف کر سے، مگر ہندوستان کا وزیر اعظم جواہرلال نہرو بہت دُور اندیش ہے۔ نہرو سے ناامید ہو کر امریکہ نے ماؤ کے بارے میں سوچا۔ امریکہ کو معلوم تھا کہ ماؤ کا یقین کمیونزم میں ہے، مگر امریکہ چینی سبھاؤ کو بھی جانتا تھا کہ کچھ بھی ہو، ماؤ، شاونیسٹ، یعنی متعصب جنونی قوم پرست ضرور ہوگا۔ لہٰذا امریکی ظاہرہ طور پر تو چان کائی شیک کو مدد دیتے رہے، لیکن اس طرح کہ لگ بھگ سارے کا سارا جنگی سامان ماؤ کی فوجوں کے ہاتھ پڑ جائے۔ اب وہ ہٹلر سے متعلق اپنی غلطی نہیں دُہرا سکتے تھے، اس لئے امریکیوں نے جنوبی کوریا اور فارموسا تک ماؤ کو نہیں پہنچنے دیا۔"

اس پر ہردت نے پھر حیرانی سے پوچھا —— "اگر یہ سچ ہے تو امریکہ نے اب تک سرخ چین کو تسلیم کیوں نہیں کیا؟" اُس کا دوست پھر ہنس دیا اور کہنے لگا —— "اس کے لئے وقت چاہیئے، دوست! یہ امریکہ کی دُور اندیشی ہے اگر تم زندہ رہے، تو میری آج کی بات یاد رکھنا کہ پندرہ بیس سال بعد سوویت روس اور دیگر سوشلسٹ ملکوں کے علاوہ ہر ملک میں کمیونسٹ پارٹی دو حصوں میں بٹ جائے گی، ایک حصہ ماسکو حامی ہوگا اور دوسرا حصہ پیکنگ حامی۔ اور اس سے بھی زیادہ بھیانک یہ بات ہوگی کہ سوویت روس کے لئے امریکہ اتنی سر دردی نہیں رہے گا، جتنی سرخ چین ہو جائے گا۔"

یہ وہی بہت خطرناک، قیدیوں والا کیمپ تھا، جہاں ہردت کی تیسری آنکھ کی بینائی بڑھنے لگی۔ جس وقت بھی تھوڑا سا موقع ملتا وہ اپنے اُس رُوسی دوست

کو کھوجنے لگتا۔ اب اس کو، اسٹالن، اُس پہیلی جیسا لگتا تھا، جسے وہ سلجھا نہیں پا رہا تھا۔ ایک دن اُس نے یہ پہیلی بھی اپنے دوست کے سامنے رکھ دی۔ اس کا دوست بڑے زور سے ہنس پڑا۔

"یار! وہ تو ربڑ کی مہر ہے، بیریہ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی۔"

۱۹۵۳ء کے ماہ مارچ کا شروع تھا، جب مشقت سے لوٹتے ہوئے قیدی، کیمپ آفیسر کے دفتر کے سامنے سے گزرے تو انھوں نے دیکھا کہ دفتر کے دروازے کے اوپر لگی ہوئی اسٹالن کی تصویر کے چوکھٹے پر کالا کپڑا لگا ہوا ہے۔

کیمپ گیٹ پر جامہ تلاشی دلوا کر، جب قیدی بیرکوں کے پاس پہنچے، تو کیمپ کے بڑے آفیسر نے اُن کو کھلی جگہ پر قطار در قطار کھڑا ہونے کا حکم دیا اور اُس وقت قیدیوں نے خوشی، حیرانی اور بے چینی سے اُس آفیسر سے یہ خبر سُنی کہ سوشلزم کے عظیم رہنما کامریڈ اسٹالن کی موت ہو گئی ہے......

سبھی قیدی جب بیرکوں کے اندر چلے گئے تو کچھ منٹ حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر خود بخود ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے.... سبھی کی رات طرح طرح کے قیاس لگانے میں گزری کہ اب اچانک اُن کو رہا کر دیا جائے گا کہ نہیں......

ہردت نے کسی سے کچھ نہیں کہا، لیکن اُسے لگا کہ اسٹالن کی موت سے لیبر کیمپوں میں کچھ تبدیلیاں ضرور آئیں گی مگر بیریہ ازم کوئی چھوٹی بلا نہیں ہے کہ راتوں رات یہ کیمپ ختم ہو جائیں......

اگلے کچھ ہی دنوں میں افواہیں سننے میں آئیں کہ کئی کیمپوں میں قیدی نافرمانبرداری پر اُتر آئے ہیں، جس کی وجہ سے قیدیوں پر نگرانی مزید بڑھ گئی ہے۔

ماہ ستمبر کے درمیان میں ہردت کو اور اس کیمپ کے بہت سے خطرناک قیدیوں

گو اومس (OMS) نامی شہر کے لیبر کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ یہاں قیدیوں کو کیمپ کے نزدیک زیر تعمیر بڑے کارخانے کی تعمیر کے کام پر بھیجا جاتا تھا۔ یہاں ہردت نے حاکم کے رویّے میں تبدیلی آتی ہوئی محسوس کی، وہ ہر بات میں بڑی احتیاط برتنے لگے تھے۔

چونکہ اُس زیر تعمیر کارخانے میں کچھ غیر قیدی لوگ بھی کام کرتے تھے۔ تو ہردت کے کانوں میں بھی باہر کی کچھ خبریں پڑنے لگیں، جن میں سے ایک یہ خبر بھی تھی کہ اسٹالن بیمار پڑ گیا تھا، ڈاکٹروں نے بڑے انجکشن لگائے لیکن اُس کے جسم کا آدھا حِصّہ بے کار ہو گیا تھا۔ یعنی لقوہ، اور وہ تین دن تک ایسا بے ہوش رہا کہ آخری دم تک ہوش میں نہیں آیا۔ اُدھر کیمپ کی دیواروں میں سے بھی چھن کر افواہیں آنے لگیں مثلاً اسٹالن کو بیریہ نے زہر دلوا کر مروا دیا ہے..... پھر یہ افواہ بھی سننے میں آئی کہ بیریہ نے کریملن پر قبضہ کرنے کے لئے M.G.B کے ٹینک بھیجے تھے مگر ڈیفنس منسٹر نے بنوی فورس سے جوابی حملہ کر کے بیریہ کو گرفتار کر لیا ہے......

۱۹۵۴ء کا ماہ جنوری تھا، جب ہردت کو تین سو قیدیوں سمیت تر رگنز گان میں بھیج دیا گیا۔ یہ وہی کیمپ تھا جہاں سے ہردت کو لگ بھگ ساڑھے دس سال پہلے رہا کیا گیا تھا۔

یہاں ہردت نے ایک بڑا فرق دیکھا کہ آفیسروں کا سلوک بالکل بدل چکا تھا۔ قیدیوں سے کہا گیا کہ ان کو جو بھی شکایت ہو، وہ لکھ دیں۔ اُن کی شکایت سیدھی کریملن بھیج دی جائے گی۔ یہ بھی بتایا گیا کہ بیمار قیدیوں سے کام نہیں لیا جائے گا، اُن کو معقول اور تسلی بخش ڈاکٹری مدد دی جائے گی۔ ہردت کو اور زیادہ حیرانی ہوئی جب بتایا گیا کہ قیدیوں کو اب محنت کی اُجرت بھی دی جائے گی.......!

یہ وقت تھا جب قیدیوں کی طرف سے بلند آواز میں ایک ہی مانگ پیدا ہوئی کہ اُن کو رہا کر دیا جائے۔ آفیسر لوگ خاموش تھے، مگر ایک دوپہر ایک سنتری نے

قیدیوں کو بتایا گیا کہ آج سے رات کے وقت بھی بیرکوں کو تالے سے بند نہیں کیا جائے گا، نمبروں سے نہیں پکارا جائے گا اور وہ ڈائننگ ہال میں آکر کھانا کھا سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔

کئی قیدیوں نے آواز اٹھائی کہ وہ جبری مشقت نہیں کریں گے۔ اس پر کئی ہفتے بعد کیمپ کے بڑے آفیسر نے آکر قیدیوں سے کہا۔۔۔ "ہم جانتے ہیں کہ جیلوں میں پڑے ہوئے لاکھوں لوگ بے گناہ ہیں۔ وہ ضرور رہا کر دیئے جائیں گے، سب کی سنوائی ہو رہی ہے۔ لیکن کچھ وقت لگے گا، تب تک سب قیدی اگر تعمیری کام میں شامل ہو جائیں تو وہ خود اپنی مدد کر رہے ہوں گے۔

یہ علاقہ تانبے کی کانوں کا تھا جو دس سال پہلے بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ جب کہ اب وہاں کانوں کا کام ہو رہا تھا۔ ہردت، اور بہت سے قیدی کانوں میں جا کر کام کرنے لگے۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے، قیدیوں کی بے چینی بڑھنے لگی اور حوصلہ بھی، بغاوتی جوش بھی۔ اس پر ہردت کو اور کئی دیگر قیدیوں کو نئے کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ چند دن بعد ہردت نے سنا کہ بغاوتی قیدیوں والے کیمپ میں قیدیوں نے مردوں اور عورتوں کے بیچ والی دیوار کو گرا دیا ہے، اس لئے اس کیمپ کی بجلی بھی کاٹ دی گئی ہے اور ساتھ ہی کھانے کی سپلائی بھی بند کر دی گئی ہے۔ پھر یہ بھی سنا کہ ایک انجنیئر قیدی نے ڈیمو بنا کر کیمپ کی بجلی کا مسئلہ حل کر دیا ہے اور کریملن سے ایک خاص آفیسر نے آکر باغی قیدیوں سے بات چیت کرنی چاہی ہے۔ پھر سننے میں آیا کہ کیمپ قیدیوں نے بات چیت کرنے سے انکار کر دیا ہے، صرف ایک ہی پیش کش سامنے رکھی ہے، کہ کیمپ بند کئے جائیں اور ان کو آزاد شہری ہونے کا حق لوٹا دیا جائے۔

اس کے بعد ہردت کو اور اس جیسے کئی قیدیوں کو تاریکی قلعے میں بند کر دیا

گیا، جہاں اُسے پتہ چلا کہ اس شہر ستوردلوو کا پرانا نام یکتریبنہ برگ ہوا کرتا تھا اور ۱۹۱۷ء والے اکتوبر انقلاب، کے دوران اسی قلعے میں زار نکولائی اور اُس کے شاہی خاندان کو گولی مار دی گئی تھی۔

اس قلعے جیل کی حالت ہردت کے لئے بالکل نئی تھی۔ کمرے کھلے اور روشن تھے۔ قیدیوں کو کتابیں پڑھنے کی بھی اجازت تھی اور شطرنج وغیرہ کھیلنے کی بھی ہر ماہ ایک بار اپنے اپنے گھر والوں کو وہ خط بھی بھیج سکتے تھے۔

یہاں اپنے مذہب وایمان کے مطابق جو قیدی عبادت کرنا چاہتے تھے۔ وہ کر سکتے تھے جب کہ اس سے پہلے ہر جیل اور کیمپ میں مذہبی عبادت پر سخت پابندی تھی۔ یہاں اُن کو بتایا گیا کہ اُن کے مقدموں کی جانچ پڑتال ہو رہی ہے، وہ جلدی رہا کر دیئے جائیں گے۔

ہردت اسی قلعے میں تھا، جب پتہ لگا کہ ہندوستان کا وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سوویت یونین میں آیا ہے اور وہ اس تاریخی شہر کو دیکھنے کے لئے آئے گا۔...... یہ رات تھی، جب ہردت کی پلکیں نہیں جڑیں...... وہ ساری رات سگریٹ پیتا رہا...... صبح ہونے کو تھی، جب پہرے کے سنتری نے اسے آواز دے کر کہا —— "تم ابھی تک نہیں سوئے؟ میں نے کل تمہارے ملک کے پرائم منسٹر کو دیکھا تھا...... ایمان سے، میں نے کبھی اس طرح کا روحانی نور والا اور انسانی سادگی والا ہنس مکھ انسان نہیں دیکھا۔

ہردت نے سنتری کا شکریہ ادا کیا، اور پلکیں موند کر اُس وقت کا تصوّر کرنے لگا جب آج سے بیس سال پہلے جواہر لال گوجرانوالہ شہر میں آیا تھا اور اُس کی تقریر کا ایک ایک لفظ ہردت نے چودہ سال کی عمر میں اپنی چھاتی میں اُتار لیا تھا......

ہردت کا دل چیخ کر رونے کو چاہا...... آج وہی جواہر لال اُس کے پاس

سے گزر رہا ہے، لیکن وہ دیوار کے پیچھے بیٹھا، اُسے آواز نہیں دے سکتا۔

۲۶

۱۹۵۵ء کے ماہ مئی میں ہردت کو انتہ نامی شہر کے لیبر کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ یہ کوئلے کی کانوں کا شہر تھا۔ کچھ دن پہلے یہاں قیدیوں کی بغاوت ہوئی تھی جسے سختی سے دبا دیا گیا تھا۔ یہاں ہردت اور اُس کے ساتھ آتے قیدیوں کو ایک مہینے کے لئے ایک الگ تھلگ بیرک یعنی کوارنٹین میں رہنا تھا، جس دوران اُس نے کسی آفیسر سے ملنا چاہا، تو اُس کی مانگ پوری ہو گئی۔ اُس نے پوچھا ـــــ "سوردلووو جیل قلعے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ میری سنوائی ہو رہی ہے، لیکن اُس کے بعد مجھے کچھ نہیں بتایا گیا۔" اس پر کیمپ کمانڈر نے کہا کہ اس کے لئے وہ عرضی لکھ کر بھیج سکتا ہے۔

اُس وقت ہردت نے نکیتا خروشوو کے نام ایک لمبا خط بھیجا جس میں اُس نے اپنی آپ بیتی کو مفصل طور پر لکھ دیا تھا۔

کوارنٹین والے مہینے کے بعد جب وہ کیمپ کے قیدیوں سے ملا، تو حیران ہوا کہ ہر قیدی کو واقعی محنت کی اُجرت مل رہی ہے۔ ہر ہفتے قیدیوں کو کوئی فلم بھی دکھائی جاتی ہے اور بے ہنر قیدیوں کو ٹیکنیکل ٹریننگ بھی دی جاتی ہے........

کام پر لگنے سے پہلے ہردت کا ڈاکٹری معائنہ ہوا، تو ڈاکٹر نے پورا میڈیکل چیک اپ کر کے کہا کہ اُس کو فوراً ہی ہسپتال میں بھیج دینا چاہیئے اور ساتھ ہی اچھی خوراک دینے کی ہدایت لکھ دی۔

یہاں ہسپتال میں جب ہردت بالکل فرصت اور آرام وہ حالت میں تھا تو اُس نے روسی زبان کے اپنے علم کو کام میں لانا چاہا۔ سوچا کہ سوویت یونیورسٹیوں کے لئے وہ اُردو اور ہندی میں کچھ کتابیں لکھ سکتا ہے۔

اُس وقت قیدیوں کو اجازت مِل چکی تھی کہ گرفتار ہونے کے وقت وہ جس میدان میں کام کر رہے تھے، اُن کاموں کو کیمپ میں جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے ہردت نے ہسپتال میں ہر مریض قیدی سے پوچھا کہ اگر کسی کا کوئی دوست یا رشتے دار ماسکو میں رہتا ہو، تو وہ کچھ ڈکشنریاں اور شمالی ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں کچھ کتابیں منگوانا چاہے گا۔ اُس وقت پاول نام کے ایک جوان روسی نے اُسے ماسکو میں رہ رہی اپنی ایک دوست کا پتہ لکھ دیا۔

دس دسمبر ۱۹۵۵ء کا دن تھا، جب ہردت نے پاول کا حوالہ دے کر مس ایوگینیہ لیوتسکایہ کو خط لکھ بھیجا۔ جس کے جواب میں تین اکتوبر کا لکھا ہوا ایوگینیہ کا جواب اُس کو مل گیا کہ ایسی کتابیں بہت کم گنتی میں چھپتی ہیں، اس لئے اس وقت نہیں مل پائیں، لیکن وہ دھیان رکھے گی اور جب بھی جو کتاب مل پائی وہ بھیج دے گی۔

پاول کے ساتھ باتیں کرنے پر ہردت کو پتہ لگا کہ وہ اور ایوگینیہ کبھی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، لیکن دس سال کی سزائے قید نے پاول کا نظریہ بدل دیا تھا، جس سے ایوگینیہ سخت پریشان بھی تھی اور ناراض بھی۔

ہردت اور ایوگینیہ کے اگلے خطوں میں اپنی اپنی زندگی کا کچھ حال حوالہ بھی لکھا جانے لگا تھا کہ ہردت کا تبادلہ کیرووو نامی شہر کے قید خانے میں ہو گیا۔ یہاں بھی صرف دو دن کا قیام، تھا، جہاں سے چند قیدیوں کے ساتھ ہردت کو قید

ریل ڈبے میں گورکی نامی شہر کی جیل میں بھیج دیا گیا۔ پھر وہاں سے آگے ہردت کو چھ جنوری ۱۹۵۶ء کے دن زبوو پلیا لنسکایہ نامی ضلع کے ایک کیمپ میں بھیج دیا گیا، جہاں سارے قیدی غیر ملکی تھے۔ یہاں قیدیوں کو کام پہ نہیں بھیجا جاتا تھا اور افواہ بھی کہ وہ سب اپنے اپنے ملکوں میں بھیجے جانے والے ہیں۔

یہاں سے ہردت نے ایوگینیہ کو اپنے نئے پتے والا خط بھیجا، جس کے جواب سے اُس نے جانا کہ ایوگینیہ نے انتہ شہر میں جاکر کیمپ میں پاول سے ملاقات کی تھی، جس کے نتیجہ میں وہ جان گئی کہ پاول سے متعلقہ اُس کی محبت کے سب خواب وقت نے توڑ دیئے ہیں اور اب وہ ہردت کی دوستی کا ایک گہرے رشتے کی صورت میں انتظار کر رہی ہے۔ ایوگینیہ نے خط میں ہردت کی فوٹو مانگی تھی۔ اور حالانکہ اُس کیمپ میں تصویر اتروانے کی اجازت تھی، مگر وہ اپنی ہڈیوں کی مٹھی بھر شکل ایوگینیہ کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔

پھر ۲۶ فروری کو ہردت کو پتہ لگا کہ اُسے کسی دوسرے کیمپ میں بھیج دیا جائے گا، اور وہاں نہ جانے کس طرح کی مناہی ہو گی، اس لئے اُس نے جلدی سے اپنی ایک تصویر اُتروا کر ایوگینیہ کو بھیج دی۔

پوتمہ نامی نئے لیبر کیمپ میں پہنچ کر اُسے پتہ لگا کہ شاید جلدی ہی اُسے ماسکو بھیج دیا جائے گا، جہاں اُس کے مقدمے کی جانچ پڑتال ہو رہی ہے۔ اُس نے یہ خبر ایوگینیہ کو لکھ بھیجی کہ شاید کچھ دن تک وہ خط نہیں لکھ پائے گا۔

ماہ مارچ کی چار تاریخ تھی جب ہردت کو ماسکو لیبیانکا جیل میں بھیج دیا گیا، جہاں اُس نے پندرہ سال پہلے کئی ہفتے گزارے تھے۔ اس جیل کی چاردیواری کے اندر پاؤں رکھتے ہوئے اُسے ہنسی سی آگئی ـــــ زمین سچ مچ گول ہوتی ہے۔ اگر پندرہ سال بعد مجھے پھر یہاں لے آئی ہے تو آخر کسی دن مجھے ہندوستان بھی

لے جائے گی، جہاں سے میں چلا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مگر ہردت حیران ہوا، جب اُسے تنہائی کی کوٹھری میں ڈال دیا گیا یہاں اُسے خط لکھنے کی بھی مناہی تھی۔ اُس کے پاس ایوگینیہ کے جتنے بھی خط تھے وہ بھی لے لئے گئے تھے۔ وہ پہرے کے سنتری سے اس کی وجہ پوچھتا رہا، لیکن سنتری کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ آخر تنگ آکر، ڈیڑھ ماہ بعد اُس نے تفتیش آفیسر کو عرضی بھیجی کہ اُسے بلایا جائے۔ تین دن بعد ایک آفیسر آیا اور اُسے تفتیش آفیسر کے پاس لے گیا۔

اُس آفیسر نے بتایا کہ اُس کے مقدمے کی دوبارہ تفتیش نہیں ہو رہی کیونکہ عدالت کی طرف سے سزا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ویسے جانچ پڑتال ہو رہی ہے، شاید کچھ دن بعد اُس کو اچھی خبر ملے گی۔

پھر آفیسر نے پوچھا ــــ "تم نے ۱۹۴۸ء میں جاسوس ہونے کا الزام قبول کیوں کیا تھا؟"

ہردت ہنس سا دیا ــــ "خود ونسٹن چرچل نے مجھے یہ کام سونپا تھا، یہ اُس وقت کے آفیسروں کو معلوم تھا، مجھے نہیں۔"

آفیسر نے آنکھیں جھکا لیں اور کہا ــــ "ہاں، وہ دن بہت خوفناک تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اگلی صبح ہردت کو اُس کوٹھری میں سے نکال کر دوسرے قیدیوں والے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ یہاں خط لکھنے کی اجازت تھی، اس لئے ہردت نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے ایک اُمید بھی سُلگا لی اور ایوگینیہ کو خط لکھا کہ قید اور آزادی کے بیچ کی جس دیوار کا فاصلہ میں پندرہ سال سے طے کر رہا تھا، وہ فاصلہ اب ختم ہونے والا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۱۹۵۶ء کے ماہ مئی کی تیس تاریخ تھی جب دوپہر کو تفتیش آفیسر نے ہردت کو بُلا کر کہا ——— "کیا حال چال ہے، کامریڈ ہردت؟"

ہردت کے کانوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ آفیسر اُسے کامریڈ کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔ قیدیوں کو مخاطب کرتے وقت اس لفظ کا استعمال سخت منع تھا۔

سُورج کی آخری سُرخی ابھی آسمان پر تھی، جب ہردت نے رہا ہو کر جیل کے مین گیٹ سے پاؤں باہر نکالے۔ سامنے دکھائی دے رہا تھا کہ رات پڑنے والی ہے۔ لیکن ہردت کی تیسری آنکھ نے لمحہ بہ لمحہ سیاہ ہوتے جا رہے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا ——— "اس رات کے دامن میں سے نیا سُورج چڑھنے کو ہے ...... اُس کی جنّت کے آسمان پر بھی، اور سوشلسٹ نظام پر بھی ....

تمّت بالخیر

فہرست مطبوعات

پطرس کے مضامین	پطرس بخاری
پطرس کے خطوط	"
تخلیقات پطرس	"
افسانے، ڈرامے، ناولٹ	"
خطبات پطرس	"
تنقیدی مضامین	"
پانچ برس لمبی سڑک	امرتا پریتم
آشیانہ	"
انچاس دن	"
زندگی نامہ	"
بلاوا	"
ڈاکٹر دیو	"
رسیدی ٹکٹ	"
ایک ہاتھ مہندی ایک ہاتھ آبلہ	"
امرتا پریتم کے افسانے	"
امرتا پریتم کی شاعری	"
محبت نامے	"
میرا کمرہ	"
پنجر	"
یہ سچ ہے	"
ناگ منی	"
رنگ کا پتہ	"
ایک لڑکی ایک جام	"
ایک تھی انیتا	"
زندگی نامہ	"
جہان دیگر	قرۃ العین حیدر
فصل گل آئی یا اجل آئی	"

مضامین رشید	رشید احمد صدیقی
خنداں	"
آشفتہ بیانی میری	"
افسانے ڈرامے	عصمت چغتائی
بدن کی خوشبو	"
چوٹیں	"
دو ہاتھ	"
دل کی دنیا	"
کلیات جگر	جگر مراد آبادی
کلیات ساحر	ساحر لدھیانوی
کلیات شکیل	شکیل بدایونی
جوش کی شاعری	جوش ملیح آبادی
گیتا نجلی	رابندر ناتھ ٹیگور
بغاوت	درشن سنگھ آوارہ
شعلہ ساز	فراق گورکھپوری
روح کائنات	"
گل نغمہ	"
پاگل	خلیل جبران
جوانی اور محبت	"
مجرم	"
مہمان	"
اس نے کہا	"
جنت ارضی	"
ارضی دیوتا	"
زرد پتے	"
افکار جبران	"
خدا اور دیوتا	"